www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

August 2006 • No. 357



بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اگست 2006

حیدرآباد کا سفر



Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-13
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 300,
Five years Rs. 480
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

حیدرآباد کا سفر

حیدرآباد میں حبیب بھائی (پیدائش ۱۹۵۴) ایک تاجر فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اور ان کے والد بابو بھائی (وفات ۱۹۸۷) دونوں شروع سے الرسالہ مشن سے جڑے ہوئے تھے۔ دونوں نے الرسالہ مشن کے لیے بہت خدمات انجام دیں۔ اب حبیب بھائی نے یہ کیا ہے کہ وہ اپنا سارا وقت دعوت کے کام میں لگا رہے ہیں۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے حیدرآباد کے ایک خوب صورت علاقے میں ایک سنٹر قائم کیا ہے۔ اِس سنٹر کا نام انٹرنیشنل سینٹر فار پیس (International Centre for Peace) ہے۔

اِس سنٹر کی دعوت پر حیدرآباد کا سفر ہوا۔ اِس سفر میں میرے علاوہ مزید دس افراد شامل تھے۔ یہ سفر ۹ مارچ ۲۰۰۶ کی صبح کو شروع ہوا، اور ۱۱ مارچ ۲۰۰۶ کی شام کو حیدرآباد سے دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔

۹ مارچ کی صبح کو ہم لوگ فجر کی نماز کے بعد ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا قافلہ تین گاڑیوں پر سوار ہو کر ائرپورٹ پہنچا۔ ائرپورٹ مسافروں کی کثرت کے اعتبار سے چھوٹا نظر آیا۔ ائرپورٹ پر بھیڑ کا یہ منظر ترقی یافتہ ملکوں میں نظر نہیں آتا۔ ائرپورٹ پر جدید سہولیات بھی کم نظر آئیں۔

حکومت ہند کا یہ منصوبہ ہے کہ ہندستان کے ائرپورٹوں کو ماڈرنائز کیا جائے اور ان کو وقت کی ضرورت کے مطابق بنایا جائے۔ مگر بہت سے نام نہاد ’’سماج وادی‘‘ لوگ اس کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حکومتِ ہند خوش حال طبقہ (haves) کی سہولیات کے لیے اس قسم کے کام کر رہی ہے۔ جب کہ ملک میں محروم طبقہ (have nots) بڑی تعداد میں موجود ہے اور اس کے مفاد کے لیے حکومت کچھ نہیں کرتی۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ ایک ناعاقبت اندیشانہ اعتراض ہے۔ یہ قانونِ فطرت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ سماجی فلاح کا کوئی کام اِس طرح نہیں ہوسکتا کہ پورا پورا سماج بیک وقت مساوی انداز میں اس سے فائدہ اٹھانے لگے۔ سماجی فلاح یا سماجی خوش حالی کے کام کے لیے ایک نقطۂ آغاز (starting point) درکار ہوتا ہے۔ ترقی کا یہ

عمل ہمیشہ اُن لوگوں سے شروع ہوتا ہے جو صاحبِ وسائل ہیں۔ بے وسائل افراد کسی بھی نتیجہ خیز کام کا آغاز نہیں کر سکتے۔ ترقیاتی عمل میں وسائل رکھنے والے افراد ابتدائی محرّک (prime mover) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی محرک کے بغیر کبھی کوئی نتیجہ خیز حرکت وجود میں نہیں آتی۔

میں نے کہا کہ اِس حقیقت کا ایک کھلا ہوا نمونہ حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں نظر آتا ہے۔ پچھلی حکومت کے زمانے میں یہاں زبردست ترقیاتی کام ہو رہا تھا۔ میں اُس زمانے میں حیدرآباد آیا تو میں نے پایا کہ حیدرآباد شہر میں ہر طرف ترقی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ مگر ترقی کا یہ عمل فطری طور پر شہروں سے شروع ہوا تھا، اور دھیرے دھیرے وہ گاؤں تک پہنچ رہا تھا۔ مگر اس عمل کی تکمیل سے پہلے الیکشن کا وقت آ گیا۔ اب ''سماج وادی'' طبقے کے لوگ حرکت میں آ گئے۔ انھوں نے دھوم کے ساتھ یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ موجودہ حکومت سرمایہ داروں کو خوش کرنے کے لیے شہروں کو ترقی دے رہی ہے۔ جب کہ گاؤں کے لوگ ابھی تک اِس ترقی میں حصہ پانے سے محروم ہیں۔ یہ بات اتنی پھیلائی گئی کہ گاؤں میں رہنے والے عوام کا ذہن حکومت کے بارے میں منفی ذہن بن گیا۔ چنانچہ الیکشن میں یہ ہوا کہ شہر کے لوگوں نے تو حکمراں پارٹی کو ووٹ دیا لیکن گاؤں کے لوگوں کی اکثریت نے اپنے ووٹ کو حکمراں پارٹی کے خلاف استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمراں پارٹی ہار گئی۔ اور نتیجۃً ترقی کا ہوتا ہوا عمل رُک گیا۔

میں نے کہا کہ حقیقی ترقیاتی عمل کے لیے دو چیزیں ناگُزیر طور پر ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اَربابِ کار کو یہ معلوم ہو کہ ترقی کا عمل ہمیشہ ایک ابتدائی مقام سے شروع ہوتا ہے۔ پورے پورے سماج کو بیک وقت اچانک ترقی یافتہ نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ کوئی ایکسپلائٹیشن کی بات نہیں ہے، یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ جو لوگ اِس اصول کو نہ جانیں وہ اپنے خود ساختہ نظریے کے تحت، صرف تخریب کاری کریں گے، وہ کسی حقیقی تعمیر کو وجود میں نہیں لا سکتے۔

دوسری ذمّے داری اُن لوگوں کی ہے جن کو موجودہ سیاسی اصطلاح میں حزبِ مخالف (opposition group) کہا جاتا ہے۔ اِن لوگوں کو سنجیدگی کا ثبوت دینا چاہیے۔ ملک کے مفاد کے

لیے اُن کا یہ فرض ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیں اور ترقی کے عمل میں غیر ضروری رُکاٹ نہ ڈالیں۔

یہ سفر ائر دکن (Air Deccan) کی فلائٹ کے ذریعے ہوا۔ دہلی سے حیدرآباد تک یہ دو گھنٹے کا سفر تھا۔ سفر کے دوران مطالعے کے لیے ائر دکن کا فلائٹ میگزین (Simplifly) کا شمارہ مارچ ۲۰۰۶ موجود تھا۔ اس میں کئی چیزیں قابلِ مطالعہ تھیں۔ میگزین کے آغاز میں کمپنی کے ڈائریکٹر کی طرف سے ایک میسیج تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ائر دکن ایک پیوپل فرینڈلی ائر لائن (people-friendly airline) ہے۔ اس کو میں نے پڑھا تو اس میں مجھے زندگی کا ایک اصول نظر آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیوپل فرینڈلی کردار کسی ائر کمپنی کا فارمولا نہیں، وہ زندگی کا ایک عمومی اصول ہے۔ جو شخص بھی اِس دنیا میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو وہی کردار اپنانا ہوگا جس کو پیوپل فرینڈلی کردار کہا جاتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اِس دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، یعنی سب کے لیے اپنے دل میں محبت کا جذبہ ہونا۔

میگزین کے ایک صفحے پر بڑے بڑے لوگوں کے بہت سے اقوال درج تھے۔ یہ اقوال، وقت کی قدر و قیمت (value of time) کے بارے میں تھے۔ ایک قول یہ تھا کہ — ایک شخص جو اپنے وقت کا ایک گھنٹہ بھی ضائع کرتا ہے اس نے زندگی کی قدر و قیمت کو دریافت نہیں کیا:

A man who dares to waste one hour of life has not discovered the value of life. (Charles Darwin)

میرا تجربہ ہے کہ لوگ عام طور پر دو چیزوں کی قدر و قیمت نہیں جانتے۔ ایک، وقت اور دوسرے، سادگی۔ حالاں کہ یہ دونوں چیزیں کسی بھی میدان میں حقیقی ترقی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ جو آدمی وقت کی اہمیت کو نہیں جانے گا وہ اپنی عمر کا بڑا حصہ ضائع کردے گا۔ اِسی طرح جو آدمی سادگی کی اہمیت کو نہ جانے وہ اپنے وسائل کا بڑا حصہ بے فائدہ طور پر کھودے گا۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے پاس بہت تھوڑا وقت ہے اور اسی طرح بہت تھوڑے وسائل۔ ایسی

حالت میں یہ ہر شخص کی لازمی ضرورت ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنے وسائل کو منظّم انداز میں استعمال کرنا جانے۔ جو آدمی ایسا نہیں کرے گا اس کو آخر میں حسرت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔ آخر میں وہ مایوسی کے ساتھ یہ کہے گا کہ میں نے کتنا قیمتی موقع کھو دیا:

Mine was the case of missed opportunity.

عقل مند وہ ہے جو خاتمۂ حیات سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لے۔ زندگی کے سفر کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے ایک ایسے خاتمے پر پہنچنے والا ہے جہاں سے واپسی کسی بھی عورت یا مرد کے لیے ممکن نہ ہوگی۔

ہندستان ٹائمس (۹ مارچ ۲۰۰۶) کے درمیانی صفحے پر ایک مضمون تھا۔ اس کے لکھنے والے مسٹر ویر سنگھوی (Vir Sanghvi) تھے۔ اِس مضمون کا عنوان یہ تھا:

Against the Current.

یہ مضمون ۷ مارچ ۲۰۰۶ کو بنارس میں ہونے والے بم دھماکے کے بارے میں تھا۔ اِس تاریخ کو بنارس کے ہنومان مندر میں بم دھماکہ ہوا۔ اس سے مندر کو کافی نقصان پہنچا۔ اِس طرح کے واقعات پر اس سے پہلے شدید ردعمل ہوتا تھا اور فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھتا تھا۔ مگر اس بار عوامی ردعمل کے اعتبار سے یہ بم دھماکہ بالکل مختلف (completely different) ثابت ہوا۔ پچھلی روایت کو دیکھتے ہوئے یہ بم دھماکہ سخت اشتعال انگیز ثابت ہوسکتا تھا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ اِس واقعے کے بعد نہ بنارس میں کوئی منفی ردعمل ہوا، اور نہ اس کو لے کر کسی دوسرے مقام پر۔

۷ مارچ کے بم دھماکے کے بعد کچھ انتہا پسند ہندو بنارس کے ہنومان مندر پہنچے۔ انھوں نے کہا کہ ہم مندر کو پَوتر کرنے کے لیے اس کو گنگا جل سے دھوئیں گے۔ لیکن مندر کے مہنت نے سختی کے ساتھ انھیں روکا، اور انھیں اپنا عمل کیے بغیر واپس جانے پر مجبور کردیا۔ میڈیا میں بھی اس کی رپورٹنگ زیادہ سنسنی خیز انداز میں نہیں ہوئی۔

بنارس، ہندوؤں کا مقدس شہر ہے۔ اس مقدس شہر میں ہندو عقیدے کے مطابق، ایک مقدس

مندر میں بم بلاسٹ ہوا۔ میڈیا میں یہ خبر بھی آئی کہ لشکرِ قہر نامی ایک مسلم تنظیم نے اِس بم دھماکے کی ذمے داری قبول کی ہے۔ اس کے باوجود امن برقرار رہا اور پچھلی روایات کے خلاف، تشدد اور توڑ پھوڑ کے واقعات نہیں ہوئے۔ میرے نزدیک اِس کا سبب یہ ہے کہ پچاس سالہ تجربے کے بعد اب ہندو کمیونٹی اور مسلم کمیونٹی دونوں نے بلا اعلان ایک خاموش فیصلہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ اب اشتعال کے باوجود وہ مشتعل نہیں ہوں گے، وہ ہر حال میں امن کو برقرار رکھیں گے۔ کیوں کہ اِس میں دونوں فرقوں کا فائدہ ہے۔ اور اس کے خلاف طریقے میں دونوں کا نقصان۔

جو لوگ ماہ نامہ الرسالہ پڑھتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ راقم الحروف نے اِس سے پہلے بار بار یہ لکھا تھا کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات صرف اُس وقت تک جاری رہیں گے جب تک دونوں فرقے امن کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ جیسے ہی وہ جان لیں گے کہ سارا فائدہ امن میں چھپا ہوا ہے اور تشدد میں صرف نقصان ہی نقصان ہے، فرقہ وارانہ فسادات کا خاتمہ ہوجائے گا۔ بنارس کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہندستان کی تاریخ میں وہ دَور آچکا ہے۔

کل شام کی ڈاک سے پاکستان کا ماہ نامہ ''سوئے حرم'' (مارچ ۲۰۰۶) ملا تھا۔ آج صبح کو اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک مضمون (مولانا وحید الدین خاں کی فکر کا تجزیاتی مطالعہ) میرے بارے میں تھا۔ اردو صحافت میں لکھنے کا جو انداز ہے اسی انداز میں یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ یعنی کسی دلیل کے بغیر صرف بیانیہ انداز میں تبصرہ کرنا۔ مثلاً اس مضمون میں کہا گیا تھا کہ — ''میں صاحبِ دعوت کی ان عظیم تحریکوں کو مسترد کرتے ہوئے ہر ایرے غیرے کو دعوت کے کام پر اکسا کر اسلامی کی حقیقی تعلیمات سے نا آشنا جدید تعلیم یافتہ افراد کو علماءِ ربّانی، صوفیا اور تبلیغی جماعت جیسے دعوتی اداروں سے دور کرنے کا بھی فریضہ انجام دے رہا ہوں''۔ (صفحہ ۸۷)

اس اقتباس میں جو بات کہی گئی ہے اس کے بارے میں میں کہوں گا کہ مضمون نگار نے علمی تنقید کو تردید کے ہم معنی سمجھ لیا۔ تنقید ایک صحت مند عمل ہے جو ساری امت میں ہمیشہ جاری رہا ہے۔ آج بھی ہر دینی مدرسے میں درسِ حدیث کے دوران ہر محدّث یہی فعل انجام دیتا ہے۔ اسی طرح تمام علماء

ایک دوسرے پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ابن تیمیہ نے صوفیاء پر تنقید کی۔ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی پر تنقید کی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تبلیغی جماعت پر تنقید کی۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے جماعتِ اسلامی پر تنقید کی، وغیرہ۔ تجزیاتی تنقید کبھی تردید کے ہم معنی نہیں ہوتی۔ وہ علمی اظہارِ خیال کے ہم معنیٰ ہوتی ہے۔ وہ ایک صحت مند فعل ہے جو علمی ترقی کا ذریعہ ہے۔ مذکورہ اقتباس میں اِس عمل کو بُرا نام دے کر مطعون کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالاں کہ کسی چیز کو برا نام دینا سرتاسر ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ (بئس الاسم الفسوق بعد الایمان، الحجرات ۱۱)

علمی تنقید و تجزیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اسلاف سے بے اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش ہے، یہ بلاشبہہ ایک صحیح چیز کو غلط نام دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی تنقید مکمل معنوں میں ایک تعمیری سرگرمی ہے۔ وہ فکری ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ علمی تنقید کا خاتمہ صرف اِس قیمت پر ہوگا کہ لوگوں کے اندر ذہنی جمود پیدا ہو جائے۔ جو بلاشبہہ فکری اور روحانی موت کے ہم معنٰی ہے۔

جہاز کے اندر پینے کے لیے کافی دی گئی۔ کافی کی پیالی پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے — ہوشیار جس چیز سے آپ محظوظ ہونے جارہے ہیں وہ بہت زیادہ گرم ہے:

Careful, the drink you are about to enjoy is extremly hot!

اِس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ گرم چائے کا جو معاملہ ہے وہی پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ یہ دنیا جس کے اندر انسان زندگی گذارتا ہے وہ بظاہر بہت پُرکشش ہے لیکن اِسی کے ساتھ وہ فتنوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ دنیا گویا ایک کانٹے دار جھاڑی ہے جس سے بہت زیادہ بچتے ہوئے انسان کو اپنا سفر کرنا ہے۔ اِس حقیقت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ جو لوگ اِس حقیقت کو سمجھے بغیر دنیا کی زندگی میں داخل ہو جائیں وہ یقینی طور پر خطرات میں مبتلا ہو جائیں گے۔

راستے میں ایک موقع پر یہ اعلان کیا گیا کہ موسم خراب ہے۔ آپ لوگ اپنی پیٹیاں باندھ لیں۔ اِس کے اگلے لمحے جہاز ہلنے لگا۔ وہ تیزی سے نیچے اور اوپر ہو رہا تھا۔ یہ کیفیت کچھ منٹ باقی رہی اس کے بعد جہاز معتدل طور پر پرواز کرنے لگا۔

جہازوں میں پرواز کے دوران اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اِس کو موسم کی خرابی یا اَپ ڈارفٹ، ڈاؤن ڈرافٹ (up draft, down draft) کہا جاتا ہے۔ جب جہاز تیزی سے ہل رہا تھا تو میں نے سوچا کہ ہماری زمین بھی ایک بہت بڑا جہاز ہے۔ وہ ہم کو لے کر رات دن مسلسل پرواز کی حالت میں رہتی ہے۔ مگر زمین میں کبھی اِس طرح کی جنبش نہیں ہوتی۔ وہ کروڑوں سال سے بالکل ہموار انداز میں حرکت کررہی ہے۔ مگر انسان اِس عظیم نعمت کا احساس نہیں کرتا۔ وہ انعام سے فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن وہ مُنعم کا اعتراف نہیں کرتا۔

انسان کی اِس بے خبری کو توڑنے کے لیے زمین پر بھونچال آتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ کوئی بھونچال انسان کی یاد ہانی کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ جب بھونچال آتے ہیں تو وہ وقتی طور پر آہ وواویلا کرتا ہے اور پھر پہلے کی طرح ہوجاتا ہے۔ قیامت کا بڑا بھونچال اس لیے آئے گا کہ وہ آخری طور پر انسان کی بے خبری کو توڑ دے، اگر چہ اُس وقت بے خبری کا یہ ٹوٹنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

۹ مارچ ۲۰۰۶ کی دوپہر کو ہمارا جہاز ٹھیک وقت پر حیدرآباد ائر پورٹ پر پہنچا۔ یہاں حبیب بھائی، احمد بھائی، مولانا عبدالرؤف قاسمی وغیرہ کئی لوگ ائر پورٹ پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر حبیب بھائی کی رہائش گاہ (جُبلی ہل) پہنچا۔ یہاں شہر کے کچھ تعلیم یافتہ افراد موجود تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ دن کا کھانا یہاں کھایا گیا۔ اس کے بعد ہم لوگ قافلے کی صورت میں حبیب بھائی کے سنٹر پر گئے۔ یہ سنٹر انھوں نے جبلی ہل کی ایک بلڈنگ میں قائم کیا ہے۔ جبلی ہل کا ایریا حیدرآباد کا سب سے زیادہ ممتاز ایریا سمجھا جاتا ہے۔ اِس علاقے میں وہ تمام سہولیات موجود ہیں جن کو جدید سہولیات کہا جاتا ہے۔

سنٹر میں کئی لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ان سے ملاقاتیں ہوئیں، اور ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ یہاں ادا کی گئی۔ نماز کے بعد حبیب بھائی کے سنٹر کا افتتاحی پروگرام تھا۔ اس کی صدارت حیدرآباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر شیو کمار نے کی۔ ان کی تمہیدی تقریر کے بعد میں نے خطاب کیا۔ سامعین میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو الرسالہ مشن سے فکری طور پر وابستہ ہیں۔ میں نے اپنی تقریر

میں کہا کہ حبیب بھائی نے یہ سنٹر جو حیدرآباد میں قائم کیا ہے وہ بہت اچھا قدم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سنٹر ترقی کرے گا اور نہ صرف مقامی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر انسانیت کا اعلیٰ پیغام پہنچانے کا ذریعہ بنے گا۔

پروفیسر کمار اس سے پہلے انگریزی کے پروفیسر تھے پھر وہ وائس چانسلر بنائے گیے۔ اب ان کی عمر ۸۵ سال ہوچکی ہے لیکن اب بھی وہ روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ سنٹر کی طرف سے انھیں میری کچھ کتابیں (انگریزی، تامل) دی گئیں۔ انھوں نے ان کتابوں کو خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کہا کہ — کم ازکم دومہینہ مجھے مولانا صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا۔ اِس موقعے پر حاضرین کے درمیان لٹریچر تقسیم کیا گیا۔

ایک گفتگو کے دَوران میں نے کہا کہ میرے تجربے کے مطابق، سادگی (simplicity) صرف ایک چیز نہیں ہے، وہ ایک مکمل لائف اسٹائل ہے۔ سادگی کا تعلق تمام چیزوں سے جڑا ہوا ہے۔ مثلاً سادگی ہے تو کفایت شعاری ہے۔ سادگی ہے تو وقت کا صحیح استعمال ہے۔ سادگی ہے تو آدمی وقت اور پیسے کے ضیاع سے بچ جاتا ہے۔ سادگی ہے تو تندرستی ہے۔ سادگی ہے تو ساؤنڈ سلیپ ہے۔ سادگی ہے تو ہاضمے کی درستگی ہے۔ سادگی ہے تو تعمیری سرگرمیاں ہیں۔ سادگی ہے تو ذہنی سکون ہے۔ سادگی ہے تو سب کچھ ہے۔ انگریزی کا مثل ہے کہ — سادہ زندگی، اونچی سوچ:

Simple living, high thinking.

سادہ زندگی اور اونچی سوچ دونوں الگ الگ چیزیں نہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہیں۔ سادہ زندگی ہوگی تو اونچی سوچ ہوگی۔ سادہ زندگی نہیں تو اونچی سوچ بھی نہیں۔

سادہ زندگی کا مطلب یہ ہے کہ صرف اہم چیز کو اہم سمجھنا، اور تمام غیر اہم چیزوں کو ثانوی درجے کے خانے میں ڈال دینا۔ حقیقت یہ ہے کہ سادہ زندگی بامقصد انسان کا کلچر ہے۔ بامقصد انسان غیر سادہ زندگی کا تحمل نہیں کرسکتا۔ غیر سادہ زندگی مقصدیت سے انحراف کے ہم معنیٰ ہے۔ غیر سادہ زندگی آدمی کو بے مقصد چیزوں میں مشغول کردیتی ہے۔ جو آدمی بامقصد زندگی گذارنا چاہتا ہو اس کو لازماً ہر معاملے میں سادگی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ کسی بھی عُذر کی بنا پر سادگی کو چھوڑنا، اپنے آپ کو

ہلاکت میں ڈالنے کے ہم معنٰی ہے۔ میرے تجربے کے مطابق، سادگی کے راستے میں سب سے بڑی رُکاوٹ بیوی، بچے اور رشتے دار ہیں۔ جو آدمی بیوی، بچوں اور رشتے داروں کے فتنے سے اوپر نہ اٹھ سکے وہ کبھی سادہ زندگی اختیار نہیں کرسکتا۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کسی بھی دن اپنی نئی زندگی شروع کرسکے۔ اِس معاملے میں کوئی بھی تاخیر حقیقی تاخیر نہیں۔ اِس نئی زندگی کا تعلق، جسمانی اعتبار سے بھی ہے اور ذہنی اور روحانی اعتبار سے بھی۔ البتہ اس کی ایک قیمت ہے اور وہ قیمت ادا کرنے کے بعد ہی کسی کو یہ درجہ مل سکتا ہے۔ یہ قیمت ہے وسیع تر معنوں میں صبر۔

مثلاً ایک شخص ہے جس کی جسمانی صحت خراب ہوچکی ہے۔ وہ ہر دن اِس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک نئی صحت مند زندگی حاصل کرسکے۔ جسمانی صحت کیوں خراب ہوتی ہے، اس کی وجہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے غلط عادت —— زیادہ کھانا، لذیذ کھانوں کا استعمال، تمبا کو اور شراب جیسی چیزیں استعمال کرنا، غصہ اور نفرت میں جینا، جنسی ہوس کا شکار رہنا، آرام طلب بن جانا، وغیرہ۔ اگر آدمی ایسا کرے کہ وہ اس قسم کی تمام خلافِ صحت عادتوں کو چھوڑ دے تو کسی بھی دن وہ اپنے لیے ایک نئی جسمانی صحت حاصل کرسکتا ہے۔

یہی معاملہ ذہنی اور روحانی ترقی کا ہے۔ آدمی ہر دن اِس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ ذہنی ترقی کا ایک نیا سفر شروع کرسکے۔ مگر یہاں بھی اس کو اس کی ضروری قیمت ادا کرنا ہے—— وقت کا بھر پور استعمال، غیر ضروری تفریحات سے اپنے آپ کو بچانا، سطحی دل چسپیوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانا، متعصّبانہ طرزِ فکر سے اپنے آپ کو پاک کرنا، اپنے اندر کامل تواضع کی صفت پیدا کرنا، ہر وقت اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار رہنا، مطالعہ اور غور وفکر کی زندگی اختیار کرنا، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے امکانات لامتناہی طور پر بہت زیادہ ہیں۔ ہر آدمی اِس پوزیشن میں ہے کہ وہ اپنی ماضی کی کوتاہیوں کو ختم کرکے نئی زندگی شروع کرسکے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اس کی

ضروری قیمت دینے کے لیے تیار ہو، اِس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ آدمی کسی بھی عذر کو عذر نہ بنائے:

If you have a good excuse don't use it.

اس دنیا میں ہر چیز قابلِ حصول ہے۔ بشرطیکہ آدمی اس کی قیمت ادا کرے۔ قیمت کی ادائیگی کے بعد مطلوب چیز مل کر رہتی ہے۔ قیمت کی ادائیگی کے بغیر کسی کو کچھ بھی نہیں ملتا، خواہ وہ کسی اور اعتبار سے اپنی تمناؤں کا پہاڑ کھڑا کر دے۔

۹ مارچ ۲۰۰۶ کی سہ پہر کو ساڑھے تین بجے حیدر آباد یونیورسٹی میں خطاب کا پروگرام تھا۔ اِس خطاب کا موضوع امن (peace) مقرر کیا گیا تھا۔ اِس موضوع پر بولنے کے لیے مجھے ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا، میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں امن کی اہمیت بتائی۔ میں نے کہا کہ امن کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر کے امن کو قائم کیا جائے۔

امن کی اصل اہمیت یہ ہے کہ امن حالات کو معتدل بناتا ہے۔ امن کی حالت قائم ہونے کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر قسم کی سرگرمیاں کسی رُکاوٹ کے بغیر جاری کی جائیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کسی سے بات کریں تو ہر آدمی حتی کہ جنگ جُو لوگ بھی یہی کہیں گے کہ ہم امن چاہتے ہیں مگر ہم کو عدل کے ساتھ امن (peace with justice) چاہیے۔ یہ ایک غیر فطری شرط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل، امن کا نتیجہ نہیں۔ عدل خود اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔ امن کے ذریعے یہ ہوتا ہے کہ مواقع (opportunities) کھل جاتے ہیں، اور اِن مواقع کو استعمال کر کے وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو عدل کہا جاتا ہے۔

تقریر کے بعد سوال اور جواب کا پروگرام تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: **رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر** ۔اِس میں جہادِ اکبر سے کیا مراد ہے۔ جہاد بالنفس یا کوئی اور عمل۔ میں نے کہا کہ جہادِ اکبر سے مراد دعوت کا عمل ہے، اور یہ خود قرآن سے ثابت ہے۔ قرآن میں ہے کہ: **وجاهدهم به جهاداً كبيراً** (الفرقان ۵۲)۔ اِس آیت میں جہاد سے

مراد جہاد بالقرآن ہے۔ یہاں جہاد بالقرآن کو جہاد کبیر کہا گیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں جس چیز کو جہادِ اکبر کہا گیا ہے اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں جہاد کبیر کہا گیا ہے، یعنی دعوتی جہاد۔

ایک سوال یہ تھا کہ ہندستان کے حالات دعوت کے لیے سخت مخالف ہیں۔ پھر یہاں دعوت کا عمل کس طرح انجام دیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے کہ ہندستان میں دعوت کے عمل کے لیے حالات سازگار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں زیادہ مواقع موجود ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندستان کی اکثریت استثنائی طور پر یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ گویا کہ وہ اسلام کی صداقت کو پہلے ہی سے امکانی طور پر مانے ہوئے ہیں۔ اس لیے اسلام کی دعوت اُن کے لیے کوئی غیر مانوس چیز نہیں۔ پھر بھی میں مانتا ہوں کہ یہاں اِس سلسلے میں کچھ رکاوٹیں ہیں مگر اس کا سبب خود مسلمان ہیں۔ انگریزی دور سے لے کر اب تک مناظرہ (debate) کیا جاتا رہا ہے۔ پہلے یہ مناظرہ اردو زبان میں ہوتا تھا۔ اب اردو زبان کے ساتھ ہندی اور انگریزی میں بھی یہ مناظرہ کیا جانے لگا ہے۔

مناظرے کی نفسیات یہ ہے کہ اس سے نفرت اور دوری پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہیں ہوتا بلکہ دونوں کے درمیان حریفانہ اور رقیبانہ رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ اِس طرح دعوت کے مواقع غیر ضروری طور پر ختم ہوجاتے ہیں۔ اِس سلسلے میں میں نے مناظرہ بازی کی تاریخ سے کئی مثالیں پیش کیں۔

ایک انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان نے سوال کیا کہ ہم خدا کی معرفت کیسے حاصل کریں اور خدا کے پسندیدہ راستے کو کیسے جانیں۔ میں نے اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اِس کا طریقہ بالکل آسان ہے۔ آپ یہ کریں کہ پہلے کھُلے ذہن کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کریں۔ اِس کے بعد موجودہ زمانے میں چھپنے والے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ اِس مطالعے کے بعد بھی اگر آپ کے سوالات باقی رہتے ہیں تو آپ اہلِ علم سے رجوع کریں، اور ساتھ ساتھ خدا سے دعا

کرتے رہیں۔ انشاء اللہ آپ کا ذہن کھل جائے گا۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ اکثر یہ کہتے ہیں کہ ہندستان میں ہمارے لیے مسلم ملکوں سے بھی زیادہ مواقع موجود ہیں۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اِس کا سبب یہ ہے کہ کسی تعمیری کام کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ پُر امن ماحول ہے۔ ہندستان میں استثنائی طور پر امن کی یہ حالت موجود ہے۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں مخصوص اسباب کی بنا پر وہ صورت حال پیدا ہوگئی ہے جس کو میں جبری امن (compulsive peace) کہتا ہوں۔ ہندستان میں دو بڑے فرقے ہیں— ہندو اور مسلمان۔ اِس جبری امن کا تعلق دونوں ہی فرقوں سے ہے۔

ہندو اِس لیے پُر امن رہنے پر مجبور ہیں کہ وہ ایک دولت پرست قوم ہیں۔ بار بار کے تجربے کے بعد انھوں نے دیکھ لیا ہے کہ جب کوئی ٹکراؤ ہوتا ہے اور بے امنی کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ان کا کاروبار بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اُن کے اندر وہ ذہن پیدا ہوگیا ہے جس کو ایک ہندو تاجر نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا— ہم فرقہ وارانہ فساد کا تحمل نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ جب بھی کسی مقام پر فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو ہمارا کاروبار ٹھپ ہوکر رہ جاتا ہے۔ ہمیں اس کی بھاری مالیاتی قیمت دینی پڑتی ہے۔ اِس لیے خود اپنے تجارتی مفاد کے لیے ضروری ہے کہ ہم فرقہ وارانہ فساد سے دور رہیں۔

یہی معاملہ دوسرے انداز میں مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان اپنے پُر جوش رہنماؤں کی باتوں سے متاثر ہوکر ایسے خیالات میں جی رہے تھے جن کو ایک معروف مسلم شاعر نے اِن الفاظ میں ادا کیا ہے:

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو　　خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو!

۱۹۴۷ کے بعد مسلمان انھیں خیالات کو لے کر نیے ہندستان میں داخل ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے بار بار شعوری یا غیر شعوری طور پر ’’باطل کی غارت گری‘‘ کا عمل کرنا چاہا مگر ہر بار انھیں یک طرفہ طور پر تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ آخر کار انھوں نے یہ محسوس کرلیا کہ ہندستان میں وہ بڑی اکثریت کے مقابلے میں چھوٹی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس لیے ’’باطل کی غارت گری‘‘ کا فارمولا یہاں قابلِ عمل نہیں۔ اپنی مجلسوں میں مسلمان اگر چہ اب بھی اِس قسم کے اشعار کو پڑھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن عملی

زندگی میں انھوں نے اِس نظریے کو مکمل طور پر چھوڑ دیا ہے۔ اب مسلمانوں میں وہی حالت قائم ہوگئی ہے جس کو میں نے جبری امن سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہندستان میں دونوں فریقوں کی طرف سے امن کی حالت قائم ہوگئی ہے۔ یہ حالت ہم کو موقع دیتی ہے کہ ہم سکون کے ساتھ اپنے تعمیری منصوبے کو بروئے کار لاسکیں۔

پروگرام کے سلسلے میں اکثر میں نے لوگوں کو اپنی ایک کمزوری بتائی ہے۔ لیکن لوگ اس کا دھیان نہیں رکھ پاتے ہیں۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ میں کار سِک (car sick) ہوں۔ کار خواہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن جب میں کار میں سفر کرتا ہوں تو بہت جلد میرے سر میں چکّر شروع ہوجاتا ہے۔ حتی کہ میں معتدل انداز میں بولنے کے قابل نہیں رہتا۔ میں نے بار بار لوگوں کو یہ بات بتائی ہے۔ لیکن چوں کہ دوسرے لوگوں کا یہ مسئلہ نہیں، اس لیے وہ میری اِس کمزوری کو سمجھ نہیں پاتے اور ایسی جگہ پروگرام رکھ دیتے ہیں جہاں مجھے قیام گاہ سے دور جانا پڑتا ہے۔ یہ سفر عام طور پر کار کے ذریعے ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت جلد میرے سر میں چکر شروع ہوجاتا ہے، اور انشراح ختم ہوجاتا ہے۔ میرے ذوق کی بات یہ ہے کہ پروگرام کسی ایک جگہ ہو مجھ کو اِدھر اُدھر جانا نہ پڑے۔ میری قام گاہ اور اجتماع گاہ دونوں ایک ہو۔ میں اپنے حالات اور اپنے مزاج کی وجہ سے اسی طریقے کو زیادہ درست سمجھتا ہوں۔

حیدرآباد یونیورسٹی کے پروگرام سے فارغ ہوکر ہم لوگ واپس روانہ ہوئے۔ حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر پہنچے تو مغرب کا وقت ہوچکا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد نشست ہوئی تو بہت سے لوگ یہاں جمع ہوگیے۔ مثلاً محمد خورشید اکرم سوز، ایوت مال (عمر ۴۱ سال) اور ڈاکٹر پی۔ کے۔ حسین مُڈاوڈر، کالی کٹ (عمر ۴۸ سال)۔ میں نے اپنی گفتگو میں کئی دینی مسائل کا ذکر کیا۔

ایک سوال یہ تھا کہ قرآن میں مجادلہ (النحل ۱۲۵) کی اجازت آئی ہے۔ کیا یہ مجادلہ وہی چیز ہے جس کو عام طور پر مناظرہ یا ڈبیٹ کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں مجادلہ کا مطلب مناظرہ نہیں، بلکہ پُر امن ڈائلاگ ہے۔ ایسا ڈائلاگ جس سے نفرت اور دوری پیدا نہ ہو۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن میں اِس آیت کے اترنے کے بعد رسول اور اصحاب رسول نے کبھی کسی سے مناظرہ نہیں کیا۔ اُن کا

طریقِ دعوت عام طور پر یہ تھا کہ قرآن کو پڑھ کر سُنانا، اوراگر ضرورت ہوتو معمولی وضاحت کرنا۔قرآن کا طریقِ تبلیغ وہی ہے جس کو دوسرے مقام پر قولاً بلیغاً (النساء ٦٣) کہا گیا ہے، یعنی دل میں اتر جانے والی بات۔

ایوت مال سے محمد خورشید اکرم صاحب پروگرام میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اوران کے ساتھی دعوتِ حق سرکل کے نام سے ایوت مال میں دعوت کا کام کررہے ہیں۔ یہ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ غیرمسلم حضرات سے براہِ راست مل کر ان سے گفتگو کرتے ہیں، اور پھر انھیں CPS International کے تحت، چھپے ہوئے دعوتی لٹریچر دیتے ہیں۔

اِسی طرح مختلف مقامات پر لوگ حلقے قائم کرکے دعوت اوراصلاح کا کام کررہے ہیں۔ مثلاً حیدرآباد، بنگلور، کالی کٹ، بمبئی، ناگپور، میرٹھ، سہارن پور، وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی کام کا فطری طریقہ ہے۔ اِسی طرح کام زیادہ نتیجہ خیز طور پر آگے بڑھتا ہے۔

حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں ۱۰ مارچ ۲۰۰٦ کی شام کو جناب حسن الدین احمد صاحب (آئی۔اے۔ایس) میری قیام گاہ پرتشریف لائے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ ان کی ایک کتاب (طُلوعِ فکر) زیرِطبع ہے۔ اِس کتاب کے ایک ٹائپ شدہ باب کی کاپی انھوں نے مجھے دی۔ یہ دراصل ان کا ایک خطبۂ صدارت تھا۔حیدرآباد میں ۵ جون ۱۹۸۸ کواسلامی مرکز دہلی کی برانچ کے افتتاح کے طور پر ایک جلسہ ہوا تھا۔ اِس جلسے کے صدر جناب حسن الدین احمد صاحب تھے۔ اِس موقع پر میں نے اسلامی مرکز کے مقاصد پر ایک تفصیلی تقریر کی تھی۔ جناب حسن الدین احمد صاحب نے آٹھ صفحے کا ایک خطبۂ صدارت پیش کیا۔ اِس میں انھوں نے راقم الحروف کی علمی اور دعوتی خدمات کا مکمل اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ’’آج مولانا وحید الدین خاں کے ساتھ جو ہورہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ البتہ عوامی طرزِعمل یہ ثابت کررہا ہے کہ مولانا بلند پایہ شخصیت کے حامل ہیں۔ مخالفت برائے مخالفت کرنے والے اُن پر ایسے الزامات عائد کرتے ہیں جن سے وہ بَری ہیں۔ ان کی

نیت پر شبہہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ۔(صفحہ:۴۵۸)

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں کی ہر چیز پرچۂ امتحان کی حیثیت رکھتی ہے۔اگر آپ کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ بھی آپ کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہے۔اس امتحان میں پورا اُترنے کی صرف دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ آپ اُس پر ایسی تنقید کریں جو مسلّمہ علمی معیار کے مطابق، درست قرار پاتی ہو۔اور اگر آپ کے اندر یہ صلاحیت نہیں تو آپ پر فرض ہے کہ آپ اس کے بارے میں خاموشی کا طریقہ اختیار کریں (**من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيراً أو ليصمت**)۔

اس کے بجائے تیسرا طریقہ اختیار کرنا فعلِ حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔یعنی بے بنیاد تنقید کرنا، حوالے کے بغیر صرف بیانیہ انداز میں تبصرہ کرنا، نیت پر شک کا اظہار کرنا، علمی تجزیہ کے بجائے تنقیص کا طریقہ اختیار کرنا، خود ساختہ معیار پر غلط قرار دینا، یہ سب تنقید کی ناجائز صورتیں ہیں۔جو آدمی یہ تیسرا طریقہ اختیار کرے وہ اپنے امتحان میں فیل ہو گیا۔

حیدرآباد یونیورسٹی سے فراغت کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس آگیے۔ یہاں پر کچھ لوگ اکھٹا ہوگیے تھے، ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ایک سوال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلام میں علم اور تعلیم کی بے حد اہمیت ہے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن میں جو پہلی وحی آئی اس میں کہا گیا تھا کہ پڑھو۔اِس سلسلے میں روایت میں آتا ہے کہ فرشتہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ پڑھو۔آپ نے فرمایا کہ ما أنا بقارئ ۔میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔اس کے بعد فرشتے نے دوبارہ کہا کہ پڑھو۔اسی طرح تیسر بار بھی یہی مکالمہ دہرایا گیا۔آخر چوتھی بار آپ نے فرشتے کے تلقین کیے ہوئے الفاظ کو پڑھا۔

اِس مکالمے میں سوال اور جواب دونوں کو ملا کر دیکھیے تو اس کا مطلب یہ سامنے آتا ہے کہ پڑھنا نہیں جانتے تب بھی پڑھو، لکھنا نہیں جانتے تب بھی لکھو۔اِس گفتگو کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بامعنیٰ ڈائلاگ تھا۔یہ علم اور تعلیم کی لامحدود اہمیت کا اظہار تھا۔یہ تعلیمی جدوجہد کا سبق تھا۔

۱۰ مارچ ۲۰۰۶ کو فجر کی نماز کے بعد ہم لوگ گھر کے ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گیے۔ یہاں

دیر تک دینی مباحث پر باتیں ہوتی رہیں۔ایک سوال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں مکّی دور ابتدائی پیریڈ کا دَور تھا، اور مدنی دور اتمامی پیریڈ کا دَور۔مگر یہ بات درست نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ مکّی دَور اسلام کی اُس حالت کا نمائندہ ہے جو مستقل طور پر ہر حال میں جاری رہتی ہے۔اور مدنی دَور اُس حالت کا نمائندہ ہے جو اسلام میں وقتی طور پر پیش آتی ہے۔اور پھر مکی دَور دوبارہ مستقل حالت کی حیثیت سے لوٹ آتا ہے۔

غالباً یہی نکتہ ہے جو ایک مشہور حدیث میں بتایا گیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک (۹ھ) سے واپس ہوئے تو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: **رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر** (ہم چھوٹے جہاد سے لوٹ کر بڑے جہاد کی طرف آئے ہیں) دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہم وقتی جہاد سے واپس ہو کر مستقل جہاد کی طرف آگیے ہیں۔

مکی دور میں قرآن میں یہ آیت اتری کہ الدین کو قائم کرو۔(**أن أقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه** (الشوریٰ: ۱۳) اِس آیت میں الدین سے مراد مکمل دین نہیں ہے بلکہ دین کا وہ حصہ ہے جو ہر حال میں قابلِ عمل ہوتا ہے۔یہاں الدین میں شرائع مراد نہیں ہیں۔یہ الدین جس پر اہلِ ایمان مکّی دور میں قائم تھے وہی اصل دین ہے، اور وہ ہر حال میں مطلوب ہے۔بقیہ چیزیں حالات پر منحصر ہیں۔مثلاً تنظیمِ معاشرہ، اقامتِ حدود، سیاسی امارت کا قیام وغیرہ اُس وقت مطلوبِ شرعی بنتے ہیں جب کہ حالات اس کے موافق ہو چکے ہوں۔

مزید یہ کہ ''مکمل دین کا نفاذ'' اسلامی مشن کا نشانہ نہیں ہے۔اسلامی مشن کا نشانہ صرف دو چیزیں ہیں— شخصی اصلاح اور پُر امن دعوت۔اِن دو کے سوا جو چیزیں ہیں وہ سب حالات پر مبنی ہیں، وہ اسلامی مشن کا براہِ راست نشانہ نہیں۔

پیغمبر اسلام کی زندگی مکہ سے شروع ہوئی اور جب آپ کی وفات ہوئی تو اسلام مدنی دَور میں پہنچ چکا تھا۔اِس بنا پر ایسا ہوا کہ بعد کے لوگوں نے مدنی دَور کو اپنے لیے ماڈل سمجھ لیا۔مکّی دَور کی حیثیت ان کے لیے ماڈل کی نہ رہی۔یہ شدید غلط فہمی ہے۔اِسی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ بعد کی مسلم نسلوں میں حاکمانہ

مزاج آ گیا۔ حالاں کہ حاکمانہ دور کی حیثیت ماڈل کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک درمیانی حالت کی ہے۔ مکّی دَور ہی اسلام کا ابدی ماڈل ہے۔ مدنی دَور، مکی دَور کے تابع ہے نہ کہ اس سے آزاد۔

اسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اہلِ علم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام میں اقتدار کی حالت (position of strength) کا ماڈل موجود ہے، لیکن اسلام میں بے اقتدار کی حالت (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکّی دَور امت کے ذہن سے عملاً حذف ہوگیا ہے۔ اب امت کے ذہن میں صرف مدنی دَور، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں عباسی دَور اور اسپینی دَور اور مغل دَور اور عثمانی دَور موجود ہے۔ اِسی بعد کے سیاسی دَور سے لوگ انسپریشن لیتے ہیں۔ مکّی دَور لوگوں کے ذہن میں زندہ شعور کی حیثیت سے موجود نہیں۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ غلو کی اسلام میں سخت ممانعت ہے۔ غلو دراصل دورِ زوال کا ظاہرہ ہے۔ غلو کا تعلق اسپرٹ سے نہیں ہے بلکہ ظواہر سے ہے۔ جب اسپرٹ ختم ہوجائے اور دین صرف ظواہر کی سطح پر باقی رہے، اُس وقت ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ظواہر کا بہت زیادہ اہتمام کرنے لگتے ہیں۔ لوگ ظواہر کے معاملے میں انتہا پسند بن جاتے ہیں۔ اِسی کا نام غلو ہے۔ غلو، دین داری کی علامت نہیں ہے بلکہ وہ اصل دین سے انحراف کی علامت ہے۔ غلو اِس بات کی علامت ہے کہ لوگوں کے اندر روحِ اسلام باقی نہیں رہی ہے اِس لیے وہ ظواہرِ دین کا اہتمام کرکے اپنے آپ کو اعلیٰ دین دار ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں مَیں نے کہا کہ سادگی (simplicity) کوئی معمولی چیز نہیں۔ سادگی کا گہرا تعلق اسلامی کردار سے ہے۔ زندگی کے معاملات میں سادگی کا طریقہ اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کا پیسہ، اس کا وقت اور اس کی توجہ غیر ضروری چیزوں میں نہ لگے۔ آدمی اپنے سارے وسائل، اپنی ساری توجہ اور اپنے تمام وقت کو صرف اپنے اعلیٰ مقصد کے راستے میں خرچ کرسکے۔ سادگی بامقصد انسان کا کلچر ہے۔ بامقصد انسان اس کا تحمّل نہیں کرسکتا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی سادگی کا طریقہ چھوڑ دے۔ بامقصد انسان کے لیے سادگی کے طریقے کو چھوڑنا مقصدی اعتبار سے اپنے آپ کو ہلاک

کرنے کے ہم معنی ہے۔ سادگی اور بامقصد زندگی دونوں ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۰ مارچ ۲۰۰۶ کی صبح کو ناشتے کے بعد ہم لوگ جامعہ دارالفرقان (للبنات) گیے۔ یہ ادارہ حیدرآباد کے سعید آباد علاقے میں واقع ہے۔ یہ تعلیمی ادارہ ۱۹۸۹ میں قائم ہوا۔ اس کے قیام کا مقصد اس کے تعارف نامے کے مطابق، یہ ہے— ''عصری علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کو عام کرنا، تا کہ خواتین میں علمی اور دینی بیداری کے ساتھ ساتھ صحیح اسلامی تعلیم کے ذریعے دینِ حق کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ جامعہ کا نصاب اِس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ طالبات (انٹرنس مماثل .S.S.C دسویں جماعت) پری ڈگری کورس (مماثل انٹرمیڈیٹ (B.A. (L کی ڈگری سندِ فضیلت کے ساتھ ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کر سکیں''۔

اِس ادارے کے بانی سیّد قطب الدین مرحوم تھے۔ اور اس کے موجودہ پرنسپل مولانا محمد اسحاق کمال صاحب ہیں۔ جامعہ دارالفرقان میں میرے خطاب کا پروگرام تھا۔ اِس خطاب کا عنوان تھا: اسلام میں عورت کا مقام۔ میں نے اِس موضوع پر ایک تفصیلی تقریر کی۔ میں نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اسلام میں عورت کو اعلیٰ انسانی مرتبہ دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، عورت اور مرد دونوں عزت اور احترام کے اعتبار سے برابر ہیں۔ البتہ دونوں کے سماجی کردار میں فرق ہے:

Equal in respect, but different in role.

میں نے کہا کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ایک مغربی اسکالر ایڈورڈ ولیم لین (وفات:۱۸۷۶) نے لکھا تھا کہ اسلام کا تباہ کن پہلو یہ ہے کہ وہ عورت کو ڈی گریڈ (degrade) کرتا ہے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں عورت کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ: النساء شقائق الرّجال۔ یعنی عورت اور مرد دونوں ایک وحدت کے دو نصف حصے ہیں:

Men and women are two equal halves of a single unit.

لیکن فطرت کی تقسیم کے مطابق، عورت اور مرد کا رول ایک دوسرے سے کوآپریٹ کرنا ہے نہ کہ ایک دوسرے سے ہم سَری کرنا (ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض، النساء ۳۲) قرآن کے مطابق، مرد کا رول قوّامیت کا رول ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت کا رول تعاون کا رول ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: زوجة صالحة تعين علیٰ دينه یعنی زندگی میں مرد کا مددگار بننا۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ والی بال کا کھیل ایک ٹیم کا کھیل ہوتا ہے۔ والی بال میں ایک والر ہوتا ہے اور دوسرا بوسٹر۔ بوسٹر کا کام گیند والر کو دینا ہے اور والر کا کام گیند کو مارنا۔ اِسی طرح زندگی میں عورت کا رول بوسٹر (booster) کا رول ہے، اور مرد کا رول پرفارمر (performer) کا رول۔ قانونِ فطرت کے مطابق، یہی صحیح تقسیم ہے۔ اِسی تقسیم کو اسلام میں اختیار کیا گیا ہے۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ امریکی سائنس داں مارگریٹ اَلوا ایڈیسن (وفات: ۱۹۳۱) میٹرک پاس بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے ایک ہزار سے زیادہ چیزیں ایجاد کیں۔ ٹیوب لائٹ اسی کی ایک ایجاد ہے۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ وہ اِس طرح ممکن ہوا کہ ایڈیسن کی ماں (Nancy) اپنے بیٹے کے لیے بوسٹر بن گئی۔ ماں کا حصہ ایڈیسن کی زندگی میں اتنا زیادہ ہے کہ ایڈیسن نے کہا:

The real force behind all of my successes is my mother.

ایڈیسن کی ماں جو کہ ایک ٹیچر تھی اس نے اپنی پوری زندگی ایڈیسن کی تعلیم وتربیت کے لیے وقف کردی۔ اس نے ایڈیسن کے اندر علم کا شوق بھی پیدا کیا اور علم کے حصول میں بھی اس کی پوری مدد کی۔ ایڈیسن نے اپنی ماں کے بارے میں کہا کہ:

She instilled in me the love and the purpose of learning.

میں نے کہا کہ اسلام کے مطابق، مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے ذہنی رفیق (intellectual partner) ہیں۔ اِس دنیا میں سب سے بڑی نعمت ایک ذہنی رفیق کا ملنا ہے۔ عورت کی صورت میں مرد کو یہی چیز دی گئی ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ اِس عظیم فطری امکان کے واقعہ نہ بننے کی سب سے بڑی ذمے داری مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ مردوں کا یہ حال ہے کہ وہ عورت کو صرف گھر کا

ایک ساتھی سمجھتے ہیں، وہ اس کو ذہنی رفیق کے روپ میں نہیں دیکھتے۔ اس کا نقصان دونوں کو سنگین صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔

خطاب کے بعد سوال اور جواب کا وقفہ تھا۔ اساتذہ اور طالبات کی طرف سے بہت سے سوالات آئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ نے **النساء شقائق الرجال** والی حدیث کا حوالہ عورت اور مرد کے درمیان عمومی برابری کے لیے دیا ہے۔ حالاں کہ یہ روایت کتاب الطہارۃ کے تحت آئی ہے۔

میں نے کہا کہ فہمِ حدیث کا ایک اصول ہے کہ کوئی حدیث قریبی سیاق کے اعتبار سے ایک خاص مفہوم میں ہوسکتی ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کا ایک توسیعی مفہوم بھی ہوتا ہے۔ یہ حدیث ایک سوال کے جواب میں آئی ہے۔ سوال ہمیشہ کسی مخصوص صورت حال کی نسبت سے ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا جواب دیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس میں ایک کُلّی مفہوم بھی بیان کردیا جاتا ہے جو عمومی حکم بتانے کے ساتھ زیرِ سوال مسئلے کے دوسرے پہلوؤں کا بھی احاطہ کررہا ہو۔

تقریر کے دَوران میں نے قرآن کے بارے میں ایک حدیث: **لاتنقضی عجائبہ** (الترمذی) کا حوالہ دیا تھا۔ اِس پر اساتذہ کی طرف سے ایک سوال یہ آیا کہ اس حدیث کو علماء نے ضعیف قرار دیا ہے۔ پھر آپ کیوں اِس حدیث کو بناءِ استدلال بنارہے ہیں۔ میں نے کہا کہ سند کے اعتبار سے بالفرض یہ روایت ضعیف ہو تب بھی حقیقت کے اعتبار سے وہ قوی ہے۔ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ قرآن کے بہت سے عجائب (معانی) بعد کے زمانے میں ظاہر ہوئے جو کہ نزولِ قرآن کے وقت لا معلوم تھے۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ کے معاصر فرعون کی لاش خدا نے محفوظ کردی ہے۔ یہ بات نزولِ قرآن کے وقت بالکل لامعلوم تھی۔ نزولِ قرآن کے بارہ سو سال بعد اس کا انکشاف ہوا، وغیرہ۔ اِس معاملے کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب عظمتِ قرآن میں دیکھی جاسکتی ہے۔

میں نے کہا کہ حدیث کو جانچنے کا اصول صرف وہی نہیں ہے جو عموماً فنِ حدیث میں مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حدیث کی صحت کو جانچنے کا ایک اور اہم تر اصول بھی ہے۔ وہ یہ کہ حدیث اگر

قرآن کے بیان سے مطابقت کررہی ہو تو اس کو صحیح مانا جائے گا۔ اِس حدیث کا معاملہ یہی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں اس مفہوم کا بیان موجود ہے۔ وہ یہ کہ آئندہ آفاق اور انفس میں خدائی نشانیاں ظاہر ہوں گی (حم السجدہ ۵۳)۔ گویا جو بات قرآن میں ایک قسم کے الفاظ میں بیان ہوئی وہی حدیث میں دوسرے قسم کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ عورت کے پردے کے بارے میں آپ نے شیخ ناصرالدین البانی کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن جو علماء وجہ اور کفّین کو حجاب سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں وہ بھی موجودہ زمانے میں اس کے قائل نہیں ہیں۔ کیوں کہ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ زمانہ فتنے کا زمانہ ہے، اور جب فتنے کا زمانہ آجائے تو احتیاط کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اِس رعایت پر عمل نہ کیا جائے۔

میں نے کہا کہ فتنے کا تعلق، صرف عورت سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مرد سے بھی ہے۔ قرآن میں مال کو سب کے لیے فتنہ کہا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: **لکل أمة فتنة و فتنة امتی المال** (ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے)۔ ظاہر ہے کہ مال کا تعلق ننانوے فیصد مردوں ہی سے ہوتا ہے۔ کیا ایسی حالت میں یہ کہا جائے گا کہ مرد مال کمانا چھوڑ دیں کیوں کہ اب وہ فتنہ بن گیا ہے۔ کسی چیز کا فتنہ بننا، ہمیشہ صرف احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے نہ کہ ترک کا، اور احتیاط اور ترک میں بہت زیادہ فرق ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ کہتے ہیں کہ عورت مرد کے لیے انٹلکچول پارٹنر ہے۔ آپ کی یہ رائے تعلیم یافتہ مردوں کے لیے تو سمجھ میں آتی ہے لیکن غیر تعلیم یافتہ مرد کس طرح اپنی بیویوں کو اپنا انٹلکچول پارٹنر بنا سکتے ہیں۔

یہ سوال اس مفروضے پر مبنی ہے کہ تعلیم یافتہ مرد اپنی بیویوں کو اپنا انٹلکچول پارٹنر بنائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ مفروضہ بذاتِ خود غلط ہے۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں کسی ایک مرد کو بھی نہیں دیکھا جو حقیقی معنوں میں اپنی بیوی کو انٹلکچول پارٹنر بنائے ہوئے ہو، خواہ اس کی بیوی تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ۔ اصل یہ ہے کہ اِس معاملے میں سب سے پہلے عورتوں اور مردوں کو باشعور بنانے کی ضرورت

ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کو اِس کے لیے تیار کریں۔ مزید یہ کہ انٹلکچول پارٹنر شپ کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ اِس کے بغیر یہ امکان واقعہ نہیں بن سکتا۔ وہ قربانی یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سادگی، صبر، ایثار، تواضع، علمی اور دینی مزاج، وغیرہ پیدا کیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ عورت کو اپنا انٹلکچول پارٹنر بنانا ابتدائی طور پر ایک امکان ہے۔ اِس امکان کو واقعہ بنانے کے لیے باقاعدہ تیاری کی ضرورت ہے۔ ہر تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ آدمی کو تیاری کے اِس کورس سے گذرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ اِس امکان کو اپنے لیے واقعہ بنا سکتا ہے۔ تیاری کے اِس عمل میں سب سے زیادہ اہمیت مکمل سادگی کی ہے۔ سادگی ایک لائف اسٹائل کا نام ہے۔ اِس لائف اسٹائل کو اپنائے بغیر کوئی گھر انٹلکچول پارٹنر شپ کا مقام نہیں بن سکتا۔

ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ایک سیمنار کرنے والے ہیں۔ انھوں نے مجھے اِس سیمنار میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ میں سیمنار کو ایک بے فائدہ کام سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے آج تک کبھی کوئی سیمنار نہیں کیا۔ البتہ دوسرے لوگوں کے سیمنار میں حسب موقع مَیں شرکت کرتا رہا ہوں، انڈیا کے اندر بھی اور انڈیا کے باہر بھی۔ یہ شرکت صرف تجربے اور مشاہدے کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں تک سیمنار کے مقصد کا تعلق ہے، اِس اعتبار سے ہر سیمنار بالکل بے فائدہ ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ سیمنار کیا ہے۔ سیمنار انٹلکچول (intellectuals) لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ اعلان کے مطابق، اس کا مقصد کسی پہلو پر ڈسکشن کرنا ہوتا ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ ہر سیمنار، بظاہر ڈائلاگ کے لیے ہوتا ہے مگر عملاً وہ مونولاگ (monologue) بن جاتا ہے۔

اس کا سبب انٹلکچول لوگوں کی ایک کمزوری ہے۔ میرے تجربے کے مطابق، ہر انٹلکچول ایگوئسٹ (egoist) ہوتا ہے۔ اس کو صرف اپنی بات سنانے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر نہ دوسروں کی بات کھلے ذہن کے ساتھ سُنتا ہے اور نہ وہ اس کو ماننے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سیمنار ایک طرح کا فکری تصادم بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ کسی فکری اتحاد تک نہیں

پہنچتا۔ سیمنار کے مفید بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شرکت کرنے والے کے اندر ماڈسٹی (modesty) کی صفت پائی جاتی ہو، ظاہری ماڈسٹی نہیں بلکہ حقیقی ماڈسٹی۔ بدقسمتی سے یہ صفت آج معدوم کے درجے میں ہے۔ اِس لیے ہزاروں سیمنار ہونے کے باوجود ان کا کوئی بھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ دوسروں کے طریقے اور میرے طریقے میں ایک بنیادی فرق ہے۔ لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بھیڑ کو خطاب کرتے ہیں۔ جتنی زیادہ بھیڑ ہو اتنا ہی زیادہ وہ اپنے پروگرام کو کامیاب سمجھتے ہیں۔ اگر بھیڑ کو خطاب کرنا کوئی کام ہو تو لاؤڈ سپیکر کا زمانے آنے کے بعد لاکھوں بار لوگوں نے بھیڑ کو خطاب کیا ہے مگر یہ سارے خطابات بالکل بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ اِس کے مقابلے میں میرا طریقہ انفرادی ذہن کو خطاب کرنا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ بیوی کے لیے رفیق حیات ایک معروف لفظ ہے جس میں سب کچھ آجاتا ہے۔ پھر آپ ایک نیا لفظ انٹلکچول پارٹنر کیوں بولتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے کہ لفظی طور پر رفیق حیات میں ساری بات آجاتی ہے، لیکن رفیقِ حیات استعمال کے اعتبار سے ایک رسمی لفظ بن گیا ہے۔ ہر آدمی رفیقِ حیات کا لفظ بولتا ہے لیکن کسی کو بھی یہ پتہ نہیں کہ رفیقِ حیات کے لفظ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنی بیوی کو انٹلکچول پارٹنر بنایا جائے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ عورت کے موضوع پر لکھی جانے والی کسی بھی کتاب میں انٹلکچول پارٹنر کا تصور موجود نہیں اور نہ آپ ایسے کسی مسٹر یا مولوی کا نام بتا سکتے ہیں جس نے شعوری طور پر اِس حقیقت کو جانا ہو اور واقعۃً اپنی رفیقِ حیات کو اپنا انٹلکچول پارٹنر بنایا ہو۔

یہ ایک عام اصول ہے کہ جب کوئی لفظ ناقص استعمال کی بنا پر اپنی معنویت کھودے تو ایک نیا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جو سننے والوں کے لیے زیادہ قابلِ فہم ہو، اور جس کے ذریعے اصل مفہوم فوراً لوگوں کے ذہن میں آجائے۔ اس لیے میں نے انٹلکچول پارٹنر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مجھے اپنے تجربے میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو یہ جانتا ہو کہ رفیقِ حیات کا مطلب اپنی بیوی کو انٹلکچول پارٹنر بنانا ہے۔ اس لیے دعوتی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے ضروری ہوا کہ اِس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ایک نیا

لفظ استعمال کیا جائے جس کو سن کر فوراً اصل مفہوم واضح ہو جائے۔ آپ کو اِس معاملے میں شک ہو تو آپ یہ دیکھیے کہ کیا وہ لوگ جو رفیقِ حیات کے لفظ سے واقف ہیں کیا وہ اِس بات کو جانتے تھے کہ رفیقِ حیات کا مطلب اپنی شریکِ زندگی کو انٹلکچول پارٹنر بنانا ہے۔

۱۰ مارچ ۲۰۰۶ کو جامعہ دار الفرقان کے پروگرام سے فارغ ہو کر ہم لوگ جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے ایک قریبی مسجد میں گیے۔ ہم لوگ مسجد میں پہنچے تو وہاں خطبے سے پہلے کی تقریر ہو رہی تھی۔ امام صاحب لاؤڈ سپیکر پر اِس قدر زور زور سے بول رہے تھے جیسے کہ کسی دشمن نے حیدرآباد پر حملہ کر دیا ہے اور وہ لوگوں کو اس کی خبر دے رہے ہیں۔ اکثر علماء اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جتنے زیادہ پُر جوش انداز میں تقریر کی جائے گی اتنا ہی زیادہ اصلاح کا کام مؤثر ہو سکے گا۔ یہ لوگ شاید اقبال کے اِس شاعرانہ تخیّل سے متاثر ہو کر ایسا کر رہے ہیں:

نوا را تلخ تر می زن، چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　حُدی را تیز تر می خواں، چو محمل را گراں بینی

میرے نزدیک اِس قسم کی شعلہ بیانی سرتاسر ایک بے فائدہ کام ہے۔ لوگوں کی اصلاح کے لیے شعلہ بیانی کی ضرورت نہیں بلکہ سنجیدہ انداز میں ذہنی تعمیر کی ضرورت ہے، اور ذہنی تعمیر کا کام شعلہ بیانی کے ذریعے نہیں ہوتا۔

نمازِ جمعہ سے فراغت کے بعد ہم لوگ حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر واپس آئے۔ یہاں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد اگلے پروگرام کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ پروگرام اُس بلڈنگ میں تھا جس کو حبیب بھائی نے دعوتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہے۔ یہاں زیادہ تر وہ لوگ اکٹھا ہوئے تھے جو ماہ نامہ الرسالہ کے پڑھنے والے ہیں اور جنھوں نے الرسالہ کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو الرسالہ کی دعوتی تحریک سے اتفاق ہے۔

یہاں میں نے دعوت کی اہمیت کے موضوع پر ایک مفصّل تقریر کی۔ اور بتایا کہ دعوت کا عمل ایک مستقل عمل ہے۔ پیغمبر آخر الزماں سے پہلے یہ کام مسلسل طور پر پیغمبروں کے ذریعے ہوتا رہا۔ اب ختمِ نبوت کے بعد امتِ محمدی کی یہ ذمّے داری ہے کہ وہ اِس کام کو نسل در نسل ساری دنیا میں جاری

رکھے۔ دعوہ ورک کوئی قومی ورک نہیں۔ دعوہ ورک کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمام انسانوں کو خدا کے تخلیقی نقشہ (Creation Plan of God) سے باخبر کیا جائے۔

پھر میں نے کہا کہ اکثر لوگ دعوہ ورک اور کمیونٹی ورک کا فرق نہیں سمجھتے۔ وہ کمیونٹی ورک کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں وہ دعوہ ورک کر رہے ہیں۔ اس طرح کچھ لوگ اصلاحِ مدرسہ اور اصلاحِ مسجد کا کام کرتے ہیں اور سمجھتے کہ وہ دعوہ ورک کر رہے ہیں۔ یہ سب بے خبری کی باتیں ہیں۔ ایسے لوگ اِس بات سے بے خبر ہیں کہ دعوت الی اللہ کیا ہے اور وہ اسلام میں کیوں مطلوب ہے۔

کچھ لوگ موجودہ مسائل کو عذر بناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان مسائل کے ہوتے ہوئے دعوہ ورک کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ قرآن کے مطابق، دعوہ ورک ہی ان مسائل کا حل ہے (المائدہ ۶۷)۔ کسی بھی عذر کی بنا پر دعوت کے کام کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنے کے بعد امتِ محمدی کا امتِ محمدی ہونا ہی مشتبہ ہو جائے گا۔

پھر میں نے بتایا کہ موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کا کام رک گیا۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کو دوسری قوموں سے قومی اور سیاسی شکایتیں پیدا ہوئیں۔ وہ دوسری قوموں سے نفرت کرنے لگے۔ حتی کہ ان کے خلاف متشددانہ جہاد چھیڑ دیا۔ اِس بنا پر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر وہ اسپرٹ ہی ختم ہوگئی جو دعوت الی اللہ کے کام کے لیے ضروری ہے۔ یعنی دوسرے انسانوں کے لیے خیر خواہی۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے دل دوسری قوموں کے خلاف شکایتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اِسی شکایت کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ معمولی معمولی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں اور دوسری قوموں سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں دعوت الی اللہ کا سنجیدہ کام کبھی انجام نہیں دیا جاسکتا۔ دعوت الی اللہ مسلمانوں کی لازمی ذمے داری ہے۔ اور اِس ذمے داری کی ادائیگی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ مسلمان، غیر مسلم قوموں کے مقابلے میں صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ اگر غیر مسلموں کی کسی روش سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تب بھی مسلمانوں کے لیے بھڑکنا اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا کرنا ہرگز جائز نہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اُن سے ایسے انداز میں بات کرو جو اُن کے دل میں اُتر جانے والی ہو (النساء: ٦٣) اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا اسلوب اختیار کرو جو لوگوں کے مائنڈ کو ایڈریس کرے۔ جو اُن پر خدائی پیغام کی صداقت کو اِس طرح کھول دے کہ وہ اس کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دعوت سے پہلے اصلاح ضروری ہے جب تک اپنی اصلاح نہ ہو جائے دعوت کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک خود ساختہ شرط ہے۔ قرآن اور حدیث میں اِس قسم کی شرط کہیں مذکور نہیں۔ صحابہ اور تابعین کا گروہ اسلام میں معیاری گروہ مانا جاتا ہے۔ انھیں لوگوں کے دعوتی عمل سے اسلام ہر جگہ پھیلا۔ مگر ان کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اُن میں سے کوئی بھی شخص نہیں جو اپنے کو مومنِ کامل سمجھتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ کامل مؤمن یا باعمل مومن کی شرط اگر ضرور قرار دی جائے تو کبھی دعوت کا عمل انجام نہیں پائے گا۔ کیوں کہ کوئی مخلص انسان یا اللہ سے ڈرنے والا انسان کبھی اِس احساس میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ وہ پورے معنوں میں مومن کامل یا باعمل مسلمان بن گیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ناقص سمجھ کر دعوت کے عمل سے رُکا رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کی شرط ایک خود ساختہ شرط ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ دعوت الی اللہ کا محرّک یہ نہیں ہے کہ میں پوری طرح باعمل مسلمان بن گیا ہوں اس لیے اب مجھے دعوت کا عمل کرنا چاہیے۔ دعوت کا محرک دوسرے انسانوں کے ساتھ خیر خواہی ہے۔ جو لوگ مذکورہ قسم کی شرطیں لگاتے ہیں ان کے دل انسانوں کی خیر خواہی سے بالکل خالی ہیں۔ اگر ان کے اندر انسانوں کے لیے خیر خواہی موجود ہو تو وہ کبھی اِس قسم کی بے بنیاد بات نہیں کہیں گے۔

مولانا محمد ذکوان ندوی نے بتایا کہ انھوں نے ١٠ مارچ ٢٠٠٦ کو حیدرآباد کی ایک قدیم جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ یہ مسجد بہت بڑی تھی۔ مسجد کے اندر جگہ جگہ بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے تھے جس پر لکھا ہوا تھا— براہِ کرم مسجد میں اپنا موبائل فون بند کر دیں۔

انھوں نے بتایا کہ خطبے سے پہلے کی تقریر میں امام صاحب نے کہا کہ مسجد میں بڑے بڑے

بورڈ پر لکھ کر یہ لگایا گیا ہے کہ لوگ مسجد میں اپنا موبائل بند رکھیں پھر بھی لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ دراصل یہود و نصاریٰ کی سازش ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان، مسجد میں بھی عبادت اور دعا کے لیے یکسو نہ رہ سکیں۔ اِس لیے انھوں نے مسلمانوں کے اندر موبائل پھیلا دیئے ہیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے واعظین کی بے شمار تقریروں کے باوجود کیوں مسلمانوں کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اِس لیے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی ہر داخلی خرابی میں ایک خارجی دشمن کی سازش کو دریافت کر لیتے ہیں اور اس کے خلاف بولنے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر داخلی احتساب کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ خارجی دشمنوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان عام طور پر منفی اندازِ فکر کا شکار ہو کر رہ گیے ہیں۔

۱۰ مارچ ۲۰۰۶ کو عصر کی نماز کے بعد ہم لوگ بھارتیہ وِدّیا بھون کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں کے وسیع ہال میں خطاب کا ایک پروگرام تھا۔ اس خطاب کا انتظام ایک ہندو تنظیم پرگنا بھارتی (آندھرا پردیش) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ یہاں کے خطاب کا عنوان یہ تھا:

Co-existence in Islam

یہ پروگرام پورا کا پورا انگریزی زبان میں تھا۔ اِس میں حیدر آباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان شریک ہوئے۔ مجھے تقریر کے لیے ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا، اور اس کے بعد سوال اور جواب کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام پرگنا بھارتی والوں نے اصلاً صرف میری تقریر کے لیے کیا تھا۔ اس کے صدر ڈاکٹر چودھری تھے۔ وہ پرگنا بھارتی کے چیرمین ہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ دنیا میں بقائے باہم (co-existence) ایک فطری فارمولا ہے۔ اور ہر فارمولا جو فطری ہو وہ اسلام کا فارمولا بھی ہے۔ کیوں کہ قرآن اور حدیث کے مطابق، اسلام فطرت کا دین ہے۔ اِس فطری فارمولے کی ایک مثال قرآن میں یہ دی گئی ہے کہ وسیع خلا میں ستارے اور سیارے مسلسل حرکت میں ہیں۔ لیکن ہر ایک اپنے مدار میں حرکت کرتا ہے۔ اِس لیے ایک اور دوسرے کے درمیان ٹکراؤ نہیں ہوتا (یٰس: ۴۰) ستاروں اور سیاروں کے اِس نظام کو

یونیورسل ماڈل آف کو اگزسٹنس کہا جاسکتا ہے۔ یہی فطری فارمولا انسان سے بھی مطلوب ہے، اِس طرح کہ خلا کے اجرام جس طریقے کو لازمی قانونِ فطرت کے تحت، مجبورانہ طور پر اختیار کیے ہوئے ہیں اس کو انسان اپنی اجتماعی زندگی میں خود اپنے ارادے اور شعور کے تحت اختیار کرے — اسی کا نام بقائے باہم ہے۔

میں نے کہا ہماری دنیا فرق (difference) کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں ہر طرف فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں نے آر۔ ایس۔ ایس کے سابق چیف گروگول والکر کا حوالہ دیا اور کہا کہ وہ بھی اس کو مانتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے:

Nature abhors uniformity.

ایسی حالت میں کوئی ایسا فارمولا قابلِ عمل ہی نہیں جو فرق اور اختلاف کو مٹانے کے اصول پر قائم ہو۔ صحیح اور قابلِ عمل بات یہ ہے کہ — ہم فرق کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھیں، ہم فرق کے باوجود متحد ہوکر جینا سیکھیں:

We have to learn the art of difference management.

میں نے کہا کہ اسلام میں دو قسم کا بقائے باہم پایا جاتا ہے۔ ایک، بلا اعلان بقائے باہم (undeclared co-existence) اور دوسرا، اعلان کے ساتھ بقائے باہم (declared co-existence)۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ روز مرّہ کی زندگی میں مسلمان اِس طرح رہیں کہ وہ کسی دوسرے کے لیے پرابلم پیدا نہ کریں۔ وہ معاشرے میں نو پرابلم انسان بن کر رہیں۔ یہ بلا اعلان بقائے باہم کی مثال ہے۔

اسی طرح میں نے صلح حدیبیہ کی مثال دی۔ میں نے کہا کہ حدیبیہ کا معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فریقِ ثانی کے درمیان اِس بات پر ہوا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف جنگی اقدام نہیں کریں گے۔ یہ اعلان کے ساتھ بقائے باہم کی مثال ہے۔

پروگرام کے خاتمے پر ڈاکٹر چودھری صدر جلسہ کی حیثیت سے اسٹیج پر آئے۔ وہ آر۔ ایس۔ ایس

کے مقامی لیڈر ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں میری باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے بتایا کہ اسلام امن اور بقائے باہم کے اصول کو مانتا ہے۔ آپ کی یہ بات ٹھیک ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہندوؤں میں گاندھی پیدا ہوئے جنھوں نے امن جیسی مثبت قدروں کی بات کی اوراس کے خلاف چلنے والوں کو کنڈم کیا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں مولانا صاحب ہی اکیلے اِس قسم کی بات کہتے ہیں۔ آخر دوسرے مسلم علماء ایسا کیوں نہیں کہتے۔ اس کے جواب میں میں نے مائک پر آ کر یہ کہا:

Gandhi was one and also Maulana is one. Moreover, Gandhi was shot dead, and Maulana is alive, addressing this mixed gathering.

اس موقع پر ہمارے ساتھی CPS International کے دعوتی بروشر اور پمفلٹ اپنے ساتھ لے گیے تھے۔ وہاں انھوں نے لوگوں کے درمیان اس کو تقسیم کیا۔ لوگوں نے بہت شوق کے ساتھ اس کو لیا اور اس کو پڑھنے میں دلچسپی ظاہر کی۔

پروگرام سے فارغ ہو کر ہم لوگ دوبارہ حبیب بھائی کے گھر واپس آگیے۔ یہاں اُس وقت باقاعدہ طور پر کوئی پروگرام نہیں تھا۔ البتہ کچھ تعلیم یافتہ افراد وہاں آگیے اور ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ بھارتیہ ودیا بھون کے پروگرام میں ڈاکٹر چودھری نے موجودہ مسلمانوں کے طرزِ عمل کے خلاف کئی باتیں کہی تھیں مگر آپ نے ان کا جواب نہیں دیا۔ مثلاً ڈاکٹر چودھری نے کہا تھا کہ مولانا محمد علی جوہر نے ایک بار اپنے بیان میں کہا کہ جہاں تک پالٹکس کا تعلق ہے مہاتما گاندھی میرے لیڈر ہیں۔ مگر جہاں تک مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کا تعلق ہے میں ایک فاسق وفاجر مسلمان کو مہاتما گاندھی سے اچھا سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ چوں کہ اسلام اور مسلمانوں کو ایک سمجھتے ہیں اس لیے آپ کو یہ چیز مسئلہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں اسلام اور مسلمانوں کو ایک نہیں سمجھتا۔ اس لیے یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے کہا کہ میری پالیسی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کے خلاف بولے تو میں ضرور اس کا جواب دیتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص مسلمانوں کے رویّے پر تنقید کرے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ میں اسلام

کا ایڈوکیٹ ہوں نہ کہ مسلمانوں کا۔ آپ لوگ مسلمانوں کے طرزِ عمل کے بارے میں مسلمانوں سے دریافت کرسکتے ہیں۔

حبیب بھائی نے یہ سوال کیا کہ آپ امن (peace) کا جو پیغام دے رہے ہیں کیا ایسی کوئی آئڈیل سوسائٹی دنیا میں رہی ہے جہاں پوری طرح امن کا ماحول قائم ہوگیا ہو۔ اگر ایسی کوئی سوسائٹی ہوتو اس کے متعلق، ہم کو بتائیں۔

میں نے کہا کہ یہ سوال صرف آپ کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ سارے مفکروں اور رہنماؤں کا سوال ہے۔ تمام لوگ یہ تلاش کررہے ہیں کہ ایسی کوئی سوسائٹی ملے جہاں اِس قسم کا پُر امن ماحول قائم ہو۔ اور جب وہ ایسی سوسائٹی نہیں پاتے تو وہ توڑ پھوڑ کی پالٹکس چلانے لگتے ہیں تاکہ اپنے خیال کے مطابق، موجودہ غیر معیاری سماج کو توڑ کر وہ مطلوب معیاری سماج بنائیں۔

میں نے کہا کہ اِس معاملے میں تمام لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ ایک غلط پیمانہ (yardstick) سے سماج کو ناپتے ہیں۔ میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دنیا کو بنانے والے نے اِس دنیا کو ٹسٹنگ گراؤنڈ کے طور پر بنایا ہے۔ اس لیے یہاں ہر ایک کو آزادی دی گئی ہے۔ ہر آدمی کو یہ موقع ہے کہ وہ اپنی آزادی کو چاہے تو صحیح طور پر استعمال کرے اور چاہے تو غلط طور پر استعمال کرے۔ یہ صورت حال اِس بات کو ناممکن بنادیتی ہے کہ یہاں کبھی آئڈیل معنوں میں پُر امن سماج بن سکے۔ کیوں کہ چند آدمی بھی اگر اپنی آزادی کو غلط استعمال کریں تو وہ سماج کے پُر امن ماحول کو خراب کرسکتے ہیں۔ ایسی حالت میں صحیح بات یہ ہے کہ کسی سماج کو آئڈیل پیمانے سے نہ ناپا جائے بلکہ اس کو پریکٹکل پیمانے سے ناپا جائے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ انسانی سماج کو آئڈیل پیمانے سے ناپتے ہیں۔ اس لیے وہ فوراً منفی رائے بنالیتے ہیں۔

صحیح اور قابلِ عمل بات یہ ہے کہ سماج کو پریکٹکل پیمانے سے ناپا جائے۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے وہ سماج جن کو آپ غیر پُر امن سماج مانتے ہیں وہ سب پُر امن سماج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ہندستان، امریکا، اور یورپ کے اکثر ممالک۔ پریکٹکل پیمانے کے اعتبار سے

یہ سارے ملک پُر امن ملک کہے جا سکتے ہیں۔لیکن آئڈیل پیمانے سے ناپنے کی وجہ سے سارے لوگ اِن ملکوں کو غیر پُر امن ممالک کہتے ہیں۔

احمد بھائی نے سوال کیا کہ دعوہ ورک کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ دعوہ ورک کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس کو سیاسی مسائل اور قومی مسائل کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔موجودہ زمانے کے مسلمان عام طور پر قومی شکایتوں میں جیتے ہیں۔ وہ سیاسی محرومی کے احساس میں مبتلا ہیں۔ مسلمانوں کی یہی نفسیات دعوہ ورک میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اِس منفی نفسیات کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ مسلمان دوسری قوموں کو''غیر قوم'' سمجھنے لگے ہیں۔ وہ ان کو اپنے حریف یا دشمن کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اِس بنا پر مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ حالاں کہ دوسری قوموں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ ہی دعوہ ورک کا اصل سرمایہ ہے۔ میرے تجربے کے مطابق، خود غیر مسلموں کی طرف سے دعوہ ورک کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بظاہر اگر کوئی رکاوٹ نظر آتی ہے تو وہ صرف اِس لیے ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان غیر مسلموں کے بارے میں معتدل نفسیات سے خالی ہوگیے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمان اِنھیں غیر مسلم قوموں سے بزنس کے تعلقات رکھتے ہیں۔وہ انھیں کے دفتروں میں جاب کرتے ہیں۔ اِس طرح ایسا ہورہا ہے کہ غیر مسلموں کے پاس مادّی مفاد کے جو مواقع ہیں ان کو تو مسلمان خوب خوب حاصل کررہے ہیں لیکن خود مسلمانوں کے پاس غیر مسلموں کو دینے کے لیے جو سچائی ہے اس کو غیر مسلموں تک پہنچانے کا کوئی جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

اِس معاملے کی ایک انتہائی مجرمانہ صورت یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان امریکا اور یورپ سے نفرت کرتے ہیں۔ امریکا اور یورپ کا نام لیتے ہی وہ اس کے خلاف نفرت کی بولی بولنے لگتے ہیں۔لیکن یہی مسلمان پہلا موقع پاتے ہی اپنے بیٹے اور بیٹی کو امریکا اور یورپ بھیج دیتے ہیں۔تاکہ وہ وہاں رہ کر وہاں کے مادّی فوائد حاصل کرسکیں۔ یہ تضاد بلاشبہہ وہی چیز ہے جس کو اسلام میں منافقت

کہا گیا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ یہ لوگ قرآن کی اِس آیت کو پڑھ کر اس سے ڈرتے نہیں: **إن المنافقين في الدرک الأسفل من النار** ۔(النساء:۱۴۵)

ایک سوال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ غصہ ایک فطری چیز ہے۔ اصل یہ ہے کہ غصہ آنا بُرا نہیں ہے۔ بلکہ غصے کا بُری شکل اختیار کرنا بُرا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: **و إذا ما غضبوهم يغفرون** (الشوریٰ:۳۷) اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن کو بھی غصہ آتا ہے۔ لیکن مؤمن غصے کی آگ کو اندر ہی اندر ڈیفیوز کر دیتا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آپ کے بارے میں اِس طرح کے الفاظ آتے ہیں: **فغضب رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى احمرّت وجنتاه**، اور **أغضب كما تغضبون**، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ غصے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی ذات پر کوئی شخص تنقید کرے تو آپ غصہ ہو جائیں۔ اِس قسم کا غصہ کبر کی علامت ہے۔ مؤمن کو چاہیے کہ وہ ایسے غصے سے اپنے آپ کو بچائے۔ دوسری صورت ہے اصول کے معاملے میں غصہ آنا۔ ایسا غصہ جائز ہے، اور معتدل دائرے میں اس کا اظہار بھی جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو غصہ آتا تھا وہ اپنی ذات کے معاملے میں نہیں تھا۔ آپ کو صرف اُس وقت غصہ آتا تھا جب کہ آپ اصول کے معاملے میں کسی کو خلاف ورزی کرتے ہوئے پاتے تھے۔ آپ کا یہ غصہ اصلاح کے لیے ہوتا تھا، وہ کسی کی تحقیر کے لیے نہیں ہوتا تھا۔

۱۱ مارچ ۲۰۰۶ کی صبح کو فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک نشست ہوئی۔ اِس میں کئی لوگ شریک ہوئے۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ الرسالہ میں یہ بات آئی ہے کہ تزکیۂ قلب سے مراد حقیقتاً تزکیۂ ذہن ہے۔ تزکیہ کا عمل معروف معنوں میں مبنی بر قلب عمل نہیں ہے بلکہ وہ مبنی بر ذہن عمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن اور حدیث میں تو اس سلسلے میں قلب کا لفظ آیا ہے پھر آپ اس کو ذہن سے کس طرح وابستہ کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ قرآن میں ایک طرف یہ آیت ہے کہ **تبياناً لكل شئ** (النحل:۸۹) دوسری

طرف یہ آیا ہے کہ: **سنریهم آیاتنا فی الآفاق و فی أنفسهم حتی یتبین لهم أنه الحق** (حم السجدہ: ۵۳) پہلی آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بوقت نزول، قرآن میں ہر بات کی تبیین ہوچکی ہے۔ جب کہ دوسری آیت بتاتی ہے کہ قرآن کی کچھ حقیقتوں کی تبیین بعد کے زمانے میں ہوگی۔ اِس اصول کو سامنے رکھیے تو مذکورہ معاملے کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن انسانی زبان میں اُترا ہے۔ قدیم زمانے میں دل کو فکر اور احساس کا مرکز مان لیا گیا تھا۔ دنیا کی تمام زبانوں میں یہ تصور اتنا رائج ہوا کہ وہ ادب کا لازمی جُز بن گیا۔ ایسی حالت میں مؤثر کلام وہی ہوسکتا تھا جو مروّجہ ادب کی زبان میں ہو۔ مثلاً انگریزی میں کہا جاتا ہے ہول ہرٹڈلی (whole heartedly)۔ اس جملے کو اگر بدل کر ہول مائنڈڈلی (whole mindedly) کہا جائے تو ادبی اعتبار سے یہ جملہ غیر مؤثر ہوکر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام زبانوں میں ادبی اعتبار سے قدیم اسلوب ہی رائج ہے۔ اگر چہ خالص سائنسی اعتبار سے صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ قرآن اور حدیث میں بھی اِسی پہلو کی رعایت کی گئی ہے۔

ایک سوال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے مولانا محمد علی جوہر کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا محمد علی چوں کہ انگریزی جانتے ہیں اس لیے انھیں غیر مسلموں کے انگریزی داں طبقے میں دعوت کا کام کرنا چاہیے تھا۔ میرے نزدیک یہ ایک سادہ لوحی کی بات تھی۔ دعوت کا کام کرنے کے لیے دعوتی شعور کی ضرورت ہے، صرف انگریزی دانی اس کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ مولانا محمد علی کا ذہن سیاسی ذہن تھا۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ دعوت کیا ہے اور دعوت کے آداب کیا ہیں۔

میں نے کہا کہ جواہر لال نہرو نے اپنی آٹو بائیوگریفی میں لکھا ہے کہ محمد علی نے ایک بار مجھ سے کہا کہ آپ کلمہ پڑھ لیجئے۔ پھر جس طرح ہم لوگ دنیا میں ایک ساتھ ہیں مرنے کے بعد بھی جنت میں ایک ساتھ رہیں گے۔ جواہر لال نہرو نے اِس بات کا مذاق اُڑایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی تعلیم یافتہ آدمی اِس قسم کی بات پر ایسا ہی ردّعمل پیش کرے گا۔ دعوتی کلام وہ ہے جو مخاطب کے ذہن کو

ایڈریس کرنے والا ہو۔ مذکورہ قسم کا کلام سادہ لوحی کی مثال تو ہوسکتا ہے مگر وہ دعوتی شعور کی مثال نہیں۔

ایک صاحب کے توسّط سے ماہ نامہ الفرقان (لکھنؤ) کا شمارہ مارچ ۲۰۰۶ دیکھنے کو ملا۔ اِس میں ایک سبق آموز بات ملی جو یہاں قابلِ ذکر ہے۔ اِس شمارے کا اداریہ (نگاہِ اوّلیں) مسلمانوں کے خلاف مغرب کی جارحیت پر تھا۔ اور اس کا عنوان الطاف حسین حالی کے اِس شعر سے لیا گیا تھا:

اے خاصۂ خاصانِ رُسُل، وقتِ دعا ہے　　　امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

پانچ صفحے کے اِس مضمون میں کہا گیا تھا کہ ــــ ''۹/۱۱ کے حادثے پر صدر بش نے اپنے جوابی فوجی عزائم کے اظہار کے لیے کروسیڈ (crusade) کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ وہ لفظ تھا جو فلسطین میں مسلمانوں کے خلاف مسیحی یورپ کے دورِ وحشت کی جنگی مہمّات کے اُس طویل سلسلے کو یاد دلاتا تھا جو صلیبی جنگوں کے نام سے معروف ہے...... اور اب ڈنمارک سے اٹھنے والے جس کارٹونی فتنے پر عالمِ اسلام اِس وقت سراپا احتجاج ہے، اس کے مقابل میں پورے مغرب (بشمول امریکا) نے جس طرح ڈنمارک کے ساتھ بیک آواز یکجہتی کا اظہار کرکے اُسے سہارا دیا ہے کہ پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر اگر گمان ایک انداز میں صلیبی مسیحیت کے لوٹ آنے اور ایک نئی کروسید کا بگل بجا دیے جانے کا گذرنے لگے تو کیسے اُسے بیجا کہا جا سکے گا''۔ (صفحہ ۳)

الفرقان کے اِس مضمون کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں جو تأثر آتا ہے وہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں پر جو ''بُرا وقت'' آیا ہے اس کا اصل سبب مغربی قوموں کی سازش اور اُن کا ظلم ہے۔ دوسری طرف اِسی الفرقان میں اس کے ایڈیٹر کی طرف سے ایک اور مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے: سفر حج سے واپسی پر۔

اس دوسرے مضمون کو پڑھ کر قاری کا جو تأثر بنتا ہے وہ پہلے تأثر سے یکسر مختلف ہے۔ دوسرا مضمون بتاتا ہے کہ رمیٔ جمرات کے موقع پر جو سنگین حادثہ ہوا اس کا سبب خود مسلمان تھے۔ یہ مسلمانوں کی اپنی داخلی بدنظمی ہے جس کی بنا پر یہ سنگین حادثہ پیش آیا۔

الفرقان کے مدیر محترم اِس حج میں موجود تھے۔ انھوں نے رمیٔ جمرات کے اُس منظر کو دیکھا تھا

جس میں تقریباً ساڑھے تین سو مسلمان شہید ہوگیے۔ اِس حادثے پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ — ''دنیا کا وہ حصہ جسے مشرقی دنیا یا تیسری دنیا کہا جاتا ہے اس میں بسنے والوں کے مزاج سے قانون اور ضابطے کی پابندی، جسے ڈسپلن کہا جاتا ہے، عرصے سے مفقود ہے۔ بدقسمتی سے اپنے دورِ انحطاط میں ہم مسلمانوں کا حال بھی اِس پہلو سے کچھ مختلف نہیں رہا''۔(صفحہ ۲۸)

پہلے اقتباس کے مطابق، مسلمان خارجی ظلم کا شکار ہیں۔ اِس کے برعکس دوسرے اقتباس کے مطابق، مسلمان اپنی داخلی اور مزاجی کمزوریوں کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمان کیوں ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ خود بھی ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی وہ ذہنی انتشار میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں وہی ہوسکتا ہے جو کہ عملاً ہورہا ہے۔

موجودہ حالت میں اصل ضرورت یہ ہے کہ داخلی اعتبار سے مسلمانوں کے اندر بے اصولی اور بدنظمی کا جو مزاج بن گیا ہے اس کی اصلاح کی جائے۔ دوسروں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف احتجاج کرنا کسی بھی درجے میں مسئلے کا حل نہیں۔

اس غلط مزاج نے مسلمانوں کے اندر ایک اور شدید تر برائی پیدا کردی ہے اور وہ ہے دوعملی۔ بار بار ایسا ہورہا ہے کہ مسلمان مغربی ملکوں کے خلاف احتجاجی تحریکیں اٹھاتے ہیں۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں پُر جوش طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ مغربی دنیا اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہوگئی ہے۔ لیکن وقتی مظاہروں کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ یہ تمام مسلمان مغربی ملکوں کے ساتھ عملاً موافقت کرلیتے ہیں۔ اور انھیں ملکوں میں بدستور آرام کے ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا کہ وہ ''اسلام دشمن'' ملکوں کو چھوڑ کر اپنے وطن واپس آجائے۔ مغربی ملکوں کی مصنوعات سے بائکاٹ کا شور تو کیا جاتا ہے لیکن کوئی ایسا نہیں کرتا کہ وہ مغربی ملکوں سے بائکاٹ کا اعلان کرکے وہاں رہنا بسنا چھوڑ دے اور وہ اپنے عزیزوں کو وہاں آباد نہ کرے، حتیٰ کہ خود الفرقان کے مذکورہ اداریہ نگار بھی۔ یہ صورتِ حال بلاشبہہ نہایت سنگین ہے، یہاں تک کہ مغربی ملکوں کی مفروضہ سازش سے بھی زیادہ۔

۱۱ مارچ ۲۰۰۶ کو صبح ۱۰ بجے حبیب بھائی کے قائم کردہ مرکز میں پروگرام تھا۔ چنانچہ میں وہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچا۔ یہ مرکز جبلی ہل میں حیدرآباد کے ایک اہم علاقے میں قائم ہے۔ یہاں الرسالہ کے قارئین اور الرسالہ مشن سے اتفاق کرنے والے لوگ بڑی تعداد میں اکھٹا ہوئے۔ اِس موقع پر میں نے ایک تفصیلی تقریر کی۔

اِس خطاب میں سب سے پہلے میں نے یہ کہا کہ حیدرآباد میں جو لوگ الرسالہ مشن سے اتفاق کرنے والے ہیں ان سب کو حبیب بھائی کے مرکز سے جُڑ جانا چاہیے۔ اِس مرکز کو بیس بنا کر دعوتی مہم کو چلانا چاہیے۔ یہاں آپ لوگوں کا ہفتے وار اجتماع ہونا چاہیے۔ جس میں دعوتی عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس وقت وہ تمام اسباب موجود ہیں جب کہ اِس مرکز کو ایک عمومی مرکز بنایا جاسکے، اور یہاں سے نہ صرف حیدرآباد بلکہ بیرونی دنیا کو بھی دعوت کا نشانہ بنایا جاسکے۔

پھر میں نے کہا کہ کچھ لوگ ہم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ کو غیر تنقیدی انداز میں اپنا مشن چلانا چاہیے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں میں کہوں گا کہ یہ لوگ ہمارے مشن کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو روایتی انداز میں سوچتے ہیں۔ ان کو اسلام سے جوڑے رکھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ ان کے سامنے پُر جوش تقریر کی جائے یا فضائل کے قصے سنائے جائیں۔ یہ کام پہلے سے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ مگر ہمارا نشانہ اصلاً وہ لوگ ہیں جو مابعد سائنس افکار سے متاثر ہوئے ہیں اور اسلام کے بارے میں ان کا یقین متزلزل ہوگیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے اسلام کو ان کی ری ڈسکوری بنائی جائے۔ اِس کام کے لیے روایتی اسلوب کارآمد نہیں ہوسکتا۔

میں نے کہا کہ تقریباً پچاس سال پہلے لاہور سے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب چھپی۔ اس کا نام تھا — قرآن اور علم جدید۔ اِس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے درمیان ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ اس کو انھوں نے ذہنی ارتداد (intellectual apostasy) سے تعبیر کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بہت سے

ایسے لوگ ہیں جو بظاہر مسلمان ہیں لیکن اندر سے وہ اسلام میں اپنا یقین کھو چکے ہیں۔ یہ ایک نئے قسم کا ارتداد ہے جس کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک عربی مقالہ لکھا تھا جو اسی زمانے میں پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا۔ اس کا نام یہ تھا: ردة ولا ابابكر لها (ایک ارتداد ہے مگر اس کے لیے کوئی ابوبکر نہیں)۔ اس زمانے میں دوسرے کئی لوگوں نے بھی اس قسم کے مضامین شائع کیے تھے۔ لیکن میرے علم کے مطابق، نہ ڈاکٹر رفیع الدین نے، نہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے، نہ مولانا ابوالاعلی مودودی نے اور نہ کسی دوسرے شخص نے اِس 'ذہنی ارتداد' کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ایسا لٹریچر تیار کیا جو وقت کے فکری مستوی کے مطابق، اِس فتنے میں مبتلا لوگوں کے ذہن کو ایڈریس کر سکے۔

مسلم دنیا میں غالباً میں پہلا شخص تھا جس نے خدا کی توفیق سے اِس مسئلے کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی، اور پھر اِس موضوع پر بہت سی کتابیں تیار کیں جو عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کے طور پر اردو اور انگریزی اور دوسری کئی زبانوں میں شائع ہوئیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اِن کتابوں سے ہزاروں لوگوں کے لیے اسلام ان کی دوبارہ دریافت بنا۔ اِسی بنا پر میری کتاب **الاسلام يتحدى** (God Arises) کو پڑھ کر ایک عرب شیخ نے اس کا ذیلی ٹائٹل یہ تجویز کیا تھا: **مدخل علمي للإيمان** (ایمان میں داخلے کا علمی دروازہ)

اس خطاب میں میں نے کئی اور باتیں کہیں جن کا تعلق ذاتی عمل سے تھا۔ آخر میں میں نے کہا کہ دعوتی عمل کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم چیز دعا ہے۔ دعا ہی کے ذریعے دعوت کے عملی مراحل طے ہوتے ہیں۔ دعا ایک مکمل عمل ہے۔ دعا کے بغیر دعوت کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ دعا ہر چیز کا بدل ہے۔

پروگرام کے بعد جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز ہوئی۔ یہاں نماز کے بعد جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی۔ ان میں سے ایک جناب حسن الدین احمد آئی اے ایس تھے۔ ان کی عمر اب ۸۳ سال ہو چکی ہے۔ میں نے کہا کہ اب تو آپ سروس سے رٹائر ہو چکے ہیں پھر آپ کی مصروفیات کیا رہتی

ہیں۔ انھوں نے کہا کہ —— میں رٹائر ملازمت سے ہوا ہوں، زندگی سے نہیں۔

نمازِ ظہر کے بعد سینٹر میں ایک نشست ہوئی جس میں شہر کی کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین شریک ہوئیں۔ مرد بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ خواتین کی طرف سے یہ سوال آیا کہ آپ کا مشن کیا ہے اور اس میں خواتین کا رول کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا مقصد اور انٹرنیشنل سینٹر فار پیس دونوں کا مقصد ایک ہے۔ وہ یہ کہ عالمی سطح پر امن اور انسانیت کا ماحول قائم کرنا تاکہ خدا کا پیغام معتدل حالات میں لوگوں تک پہنچایا جاسکے، اور وہ دنیا بنائی جاسکے جہاں لوگ ایک طرف خدا کے پرستار ہوں اور دوسری طرف انسانوں کے خیر خواہ۔ یہی ہماری سرگرمیوں کا نشانہ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ خواتین کا مطالعہ عام طور پر پردہ اور حجاب کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان کا نام بھی پردہ اور حجاب جیسا ہوتا ہے۔ مگر یہ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشے میں عورت کا ایک مثبت رول (positive role) ہے۔ میں نے اِس بات کی وضاحت کے لیے ایک پوری کتاب لکھی ہے جو ”عورت، معمار انسانیت“ کے نام سے چھپ چکی ہے۔ وہ دوسو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔

میری گفتگو جاری تھی کہ ایک صاحب نے درمیان میں ایک غیر متعلق (irrelevant) سوال کر دیا۔ یہ ایک مسلمان تاجر تھے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر جھگڑالو ہے۔ ایسی حالت میں وہ لوگوں کے درمیان امن کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہے۔ ان کا یہ سوال ایک غیر متعلق سوال تھا اور اِسی کے ساتھ ایک اچانک اور غیر معقول مداخلت بھی۔ میں ایک بے حد اصول پسند آدمی ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی بُرا کہے تو مجھ کو غصہ نہیں آتا۔ لیکن بے اصولی کی بات پر مجھے غصہ آجاتا ہے۔ چنانچہ مجھے سخت غصہ آگیا۔ میں نے سختی کے ساتھ کہا کہ آپ کو سوال کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ سوال کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

سوال کے سلسلے میں پہلا کام چپ رہ کر اُس کے بارے میں سوچنا ہے۔ لوگ اکثر سوچے بغیر سوال کیا کرتے ہیں۔ جو سوال انھیں اپنے آپ سے کرنا چاہیے اس کو دوسروں سے کرنے لگتے ہیں۔

اسی لیے ایک صحابی نے کہا: نُهينا عن كثرة السؤال وعن كثرة القيل والقال (ہم کو زیادہ سوال کرنے سے اور زیادہ قیل وقال کرنے سے منع کیا گیا ہے)

میرا انداز سخت تھا۔ چنانچہ مذکورہ مسلمان کافی غصہ ہوگیے۔ اگر چہ اس وقت وہ خاموش ہوگیے مگر ان کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ غصے میں ہیں۔ پروگرام ختم ہوا تو میں فوراً اٹھ گیا۔ اس کے بعد میرا ایک اور پروگرام تھا وہاں مجھے پہنچنا تھا۔ اس لیے میں تیزی کے ساتھ باہر آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا تاکہ آگے جاسکوں۔ بقیہ لوگ ابھی اندر تھے۔

حاضرین میں مولانا محمد ذکوان ندوی موجود تھے۔ انھوں نے بعد کو بتایا کہ میرے جانے کے بعد مذکورہ مسلمان غصے کی حالت میں کافی بولنے لگے، اور مجھ کو زور زور سے بُرا بھلا کہنے لگے۔ الرسالہ کے قارئین کا حلقہ اور سی پی ایس ٹیم کے لوگ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ مذکورہ مسلمان شدید غصے میں مجھے بُرا بھلا کہہ رہے ہیں اور شکایت کر رہے ہیں تو انھوں نے یک طرفہ طور پر اُن سے کہا کہ آپ بجا فرما رہے ہیں۔ یہ ہماری ہی غلطی تھی کہ ہم لوگوں نے آپ کو سوال کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں۔ آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر یہاں آئے ہم کو اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

اِس کے بعد مذکورہ مسلمان بولتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اُس وقت میں اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ حافظ عبد الغفار صاحب کے بتانے پر میں گاڑی سے باہر آیا اور مذکورہ مسلمان سے کہا کہ اِس معاملے میں ساری غلطی میری تھی آپ مجھے معاف فرمائیں۔ وہ اتنا زیادہ غصے میں تھے کہ وہ معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں نے بہت زیادہ کہا یہاں تک کہ قریب تھا کہ میں ان کا پاؤں پکڑ لوں۔ آخر کار وہ نرم پڑے اور کہا کہ کوئی بات نہیں، ایسا تو کبھی ہو جاتا ہے۔

پھر میں ان کو لے کر قریب کی ایک جگہ پر باہر ہی بیٹھ گیا۔ اُس وقت بہت سے لوگ کھڑے ہو کر ساری باتیں سُن رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ نے جو سوال کیا تھا، موجودہ واقعہ گویا اسی کا ایک عملی جواب تھا۔ آپ کا سوال قرآن کی اِس آیت کے بارے میں تھا: وكان الانسان اكثر شيئ جدلاً۔

(الکہف ۵۴)ان کا کہنا تھا کہ جب قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان فطری طور پر ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ پھر وہ صبر کیسے کرسکتا ہے۔

میں نے کہا کہ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کے بارے میں مطلوب معیار یہ نہیں ہے کہ وہ غصّہ یا جھگڑا نہ کرے۔ بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ اپنی فطری ساخت کے مطابق، اس کے اندر غصے کے جذبات پیدا ہوں اور وہ جھگڑنے لگے۔ مگر وہ اس پر قائم نہ رہے۔ بلکہ اس کے بعد وہ توبہ کرے اور معافی مانگے۔ خدائی نقشے کے مطابق، اعلیٰ انسان وہ نہیں ہے جو سرے سے کوئی غلطی ہی نہ کرے۔ بلکہ اعلیٰ انسان وہ ہے جو غلطی کرے اور پھر غلطی کا اعتراف کرکے اس سے معافی مانگے۔ توبہ اور غلطی کا اعتراف خود بہت بڑی نیکی ہے۔ اس نیکی کو حاصل کرنے کے قابل آدمی اُسی وقت بن سکتا ہے جب کہ اس کے اندر غلطی کرنے کا رجحان ہو۔ اعتراف ہمیشہ احساسِ غلطی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ احساسِ غلطی نہیں تو اعتراف بھی نہیں۔

اِس گفتگو کے وقت جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے ایک مسٹر جَیَونت راؤ پاٹل بھی تھے وہ ناندیڑ کے رہنے والے ہیں اور شروع ہی سے ماہ نامہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے اِس پورے منظر کو دیکھا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں ہم معافی اور یک طرفہ صبر اور اعتراف کے بارے میں بہت پڑھتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ مگر آج اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

الرسالہ مشن اور سی پی ایس سے جُڑے ہوئے کئی لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے اِس پورے واقعے کو دیکھا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ اِس پورے پروگرام کا خلاصہ یہی واقعہ تھا جو گویا ہمارے الرسالہ مشن کا پریکٹکل نمونہ ہے۔ الرسالہ مشن کا خاص پہلو یہ ہے کہ منفی واقعے کو مثبت پہلو میں تبدیل کیا جائے۔ یہ واقعہ اِس اعتبار سے اِس حقیقت کا ایک عملی نمونہ تھا۔

حیدرآباد کے پروگرام کے بارے میں حبیب بھائی نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ یہ پروگرام ہر اعتبار سے نہایت کامیاب تھا۔ انھوں نے کہا کہ جس مقصد کے لیے یہ پروگرام کیا گیا تھا وہ مقصد پورا ہوا۔ خاص طور پر مجھے ذاتی اعتبار سے اِس بات کی خوشی ہے کہ میرے بیٹے اور بہو جو اس سے پہلے

اسلام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے تھے اب انھوں نے باقاعدہ نماز شروع کردی ہے۔ اور وہ انگریزی کتابیں مطالعے کے لیے لے گیے ہیں۔

حیدرآباد کے روزنامہ اخبار ''مُنصف'' (۱۱ مارچ ۲۰۰۶) میں ایک خبر اِس عنوان کے تحت تھی: ''برطانوی باشندوں میں اسلام سے واقفیت کا رُجحان''۔ یہ خبر اسلامی دعوت کے امکان کو بتاتی ہے۔ منصف سے لے کر اِس خبر کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ریاض۔ ۱۰/مارچ (ایجنسیز) برطانوی باشندوں میں عربی زبان اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ پروفیسر لیسلی میک لاگلن نے اپنے دورۂ سعودی عرب کے اختتام پر بتایا کہ غیر مسلم دنیا مسلمانوں کے تعلق سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کررہی ہے۔ پروفیسر میک لاگلن نے جنھوں نے ریاض اور جدہ میں عربی اور اسلامی تعلیمات پر لکچر دیے ہیں، عرب نیوز کو بتایا کہ برطانیہ کی ۱۲ یونیورسٹیز میں عربی زبان اور اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ امریکا میں ۱۱ ستمبر کے بعد غیر مسلم دنیا میں اسلام سے متعلق واقفیت حاصل کرنے کی دلچسپی بڑھ گئی ہے، اس کے علاوہ خلیجی ممالک میں عربی جاننے والوں کے لیے بڑھتے ہوئے روزگار کے مواقع کے پس منظر میں بھی برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں عربی جاننے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ۱۹۶۱ میں برطانیہ میں عربی سیکھنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ فی الحال عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے والوں میں سے ۵۰ فی صد تعداد خواتین کی ہے۔ برطانوی پروفیسر نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ میڈیا آرگنائزیشن میں حتیٰ کہ برطانیہ کے دفتر خارجہ میں بھی عربی جاننے والوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہورہے ہیں''۔ (صفحہ ۵)

منصف کے اسی شمارے میں ایک اور خبر تھی، جس کا عنوان یہ تھا— ''اٹلی کے کارڈینل اسکولوں میں مسلم طلباء کو قرآن پڑھانے کے حامی''۔ مذکورہ خبر کے الفاظ یہ تھے:

''روم۔ ۱۰/مارچ (ایجنسیز) اٹلی کے ایک سرکردہ عیسائی رہنما کارڈینل نے اٹلی کے

سرکاری اسکولوں میں قرآن حکیم کے درس وتدریس کی حمایت کی ہے۔ کارڈینل کی یہ اجازت عالم اسلام کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ویٹیکن کی خواہش کا اظہار سمجھا جارہا ہے۔ عیسائی رہنما نے کہا کہ اطالوی مسلم تنظیموں کی اس تجویز سے وہ اتفاق کرتے ہیں جس میں مسلم طلباء کو سرکاری اسکولوں میں قرآن حکیم کی تعلیم دینے کی بات کہی گئی ہے''۔(صفحہ ۵)

یہ دونوں خبریں منصف کے ایک ہی شمارے میں تھیں۔ مغربی دنیا میں، بشمول ڈنمارک، ہردن اِس طرح کی سیکڑوں خبریں وجود میں آتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اِس قسم کی مثبت خبروں کو نمایاں طور پر مسلم اخباروں میں چھاپا جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مغربی ملکوں کے بارے میں مسلمانوں کے منفی جذبات ختم ہوں گے اور دونوں کے درمیان وہ معتدل فضا قائم ہوجائے گی جو دعوت الی اللہ کے لیے ضروری ہے۔ مسلمانوں کے اوپر سب سے بڑا فرض دعوت الی اللہ ہے۔ مگر مسلمانوں کے منفی ذہن کی بنا پر یہ کام عملاً تقریباً رُک گیا ہے۔

۱۱ مارچ ۲۰۰۶ کی سہ پہر کو ہم لوگ ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ حیدرآباد کے ائرپورٹ پر پہنچے تو یہاں کافی بھیڑ نظر آئی۔ حیدرآباد کے لیے میرا پہلا ہوائی سفر جنوری ۱۹۸۳ میں ہوا تھا۔ اس وقت کے مقابلے میں آج حیدرآباد ائرپورٹ پر بہت زیادہ بھیڑ دکھائی دی۔ پچھلے برسوں میں حیدرآباد نے کاروباری اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اِس بنا پر یہاں ہوائی جہاز کی آمدورفت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن جس نسبت سے ہوائی سفر بڑھا ہے اُس نسبت سے ایرپورٹ کی توسیع نہیں ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ حکومت ایک نیا ہوائی اڈّہ بنانا چاہتی ہے۔ جو بہت بڑا ہوگا اور وہ انٹرنیشنل معیار کے مطابق بنایا جائے گا۔

واپسی کا یہ سفر ایر دکن کی فلائٹ کے ذریعے ہوا۔ جہاز میں مطالعے کے لیے ویکلی اخبار تہلکہ (Tehelka) کا شمارہ ۱۱ مارچ ۲۰۰۶ موجود تھا۔ اخبار میں ایک رپورٹ اِس عنوان کے تحت چھپی تھی — قتل کی آزادی: Freedom to Kill۔

یہ رپورٹ نئی دہلی کے مسٹر مہیش کمار کے قلم سے تھی۔ اِس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اظہارِ خیال

کی آزادی کا مطلب حد کو پار کرنا اور صحافتی ضابطے کو توڑنا نہیں ہے۔ کارٹون کے خلاف احتجاج کرنا واضح طور پر ایک فطری ردّعمل ہے۔ لیکن احتجاج کو مہذب انداز میں ہونا چاہیے، اور مسلّمہ قانون کے مطابق ہونا چاہیے۔ نہ کہ لوگوں کی جائدادوں کو نقصان پہنچا کر اور لوگوں کو خوف زدہ کرکے:

> Freedom of expression doesn't mean crossing limits and the code of Journalism. The protests against such cartoons is an obvious and automatic reaction. But the protests, too, should be in a civilised manner and as per the accepted terms of law, and not by damaging public property or by harassing the people. (p. 2)

اکثر لوگ اِس قسم کی باتیں لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ الفاظ گریمر کے اعتبار سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہیں۔ ایسے لوگ جو ایک کاغذی خاکے پر مشتعل ہوجائیں ان سے یہ امید کرنا کہ جب وہ اپنے مشتعل جذبات کے ساتھ بھیڑ کی صورت میں سڑکوں پر آئیں گے تو وہ پُر امن رہیں گے، اِس قسم کا نظریہ ایک ناممکن مفروضے پر قائم ہے۔ اِسی ناممکن مفروضے پر تنقید کرتے ہوئے ایک فارسی شاعر نے کہا تھا:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ   بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

اس ناممکن مفروضے کا تجربہ بار بار ہوچکا ہے۔ بار بار یہ واقعہ پیش آیا کہ مشتعل جذبات کے حامل لوگوں کو یہ کہہ کر جلوس کی اجازت دے دی جاتی ہے کہ تم لوگ پُر امن رہنا۔ مگر ایسے جلوس کبھی پُرامن نہیں رہتے۔ ایسی حالت میں اِس ناکام تجربے کو مزید دہرانا ایک ایسی نادانی ہے جس کی کوئی عقلی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

تہلکہ کے مذکورہ شمارے میں ایک مفصل رپورٹ بمبئی کے مدرسوں کے بارے میں تھی۔ رپورٹ کے مطابق، بمبئی میں ان مدرسوں کی تعداد ۸۰ ہے۔ دو صفحے کی اِس رپورٹ کا عنوان یہ تھا:

Please leave us to our devices, they work fine

اِس رپورٹ میں محمد علی روڈ پر واقع ایک مدرسے کی تصویر تھی۔ اِس میں تحفیظ القرآن کے ایک کلاس کا منظر دکھایا گیا تھا۔ تقریباً ۲۵ طلبا قرآن کے نسخے لے کر اس کو حفظ کر رہے ہیں۔ درمیان میں

ایک تنومند استاد مخصوص انداز سے گاؤ تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ منھ میں پان ہے اور سر پر اونچی ٹوپی۔ اتنے میں ان کے موبائل ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں موبائل لے کر نہایت اطمینان کے ساتھ بات کرنے لگتے ہیں۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Wait and watch: a phone call interrupts classes.

یہ زمانہ گویا موبائل انفجار (mobile explosion) کا زمانہ ہے۔ موبائل کا استعمال اتنا عام ہوگیا ہے کہ ہر مولوی اور غیر مولوی کے ہاتھ میں موبائل دکھائی دیتا ہے۔ موبائل بلاشبہہ موجودہ زمانے کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اِس کے بے شمار فائدے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ میں نے موبائل استعمال کرنے والوں میں سے کسی میں اس پر حقیقی شکر کا جذبہ نہیں پایا۔ موجودہ زمانے کا یہ عام مزاج ہے — نعمتوں کا استعمال، لیکن مُنعم کا اعتراف نہیں۔

۱۱ مارچ ۲۰۰۶ کی شام کو تاخیر کے ساتھ جہاز دہلی کے ائرپورٹ پر اترا۔ ائرپورٹ پر اترنے کے بعد بھی مزید تقریباً آدھ گھنٹہ تاخیر ہوئی۔ کیوں کہ جہازوں کی کثرت کی وجہ سے جہاز فوراً آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ تاخیر کا مسئلہ صرف بسوں اور ٹرینوں میں ہے لیکن اب تاخیر کا مسئلہ ہوائی جہازوں تک پہنچ چکا ہے۔ ترقی کے ہجوم کے درمیان عدم ترقی کا یہ ماحول صرف ہندستان میں دیکھا جاسکتا ہے۔

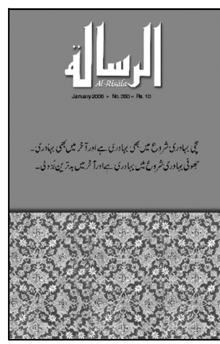
آزادی سے پہلے ہمارے لیڈروں نے یہ سُہانا خواب دیکھا تھا کہ آزادی کے بعد ہر طرف ترقی کا سیلاب جاری ہوجائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ میرے نزدیک اِس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آزادی کے بعد ملک نے صحیح رخ پر اپنا سفر شروع نہیں کیا۔ آزادی کے بعد یہ ہوا کہ ملک کولونیل ایکسپریس سے نکل کر سوشلسٹ ایکسپریس میں بیٹھ گیا۔ عجیب بات ہے کہ سوشلسٹ نظریہ کمیونسٹ ملکوں میں ختم ہوگیا۔ لیکن ہندستان میں وہ شان دار طور پر جاری رہا۔ میرے نزدیک سوشلسٹ طریقہ ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ سوشلسٹ طریقے کو اختیار کرکے کوئی ملک کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔

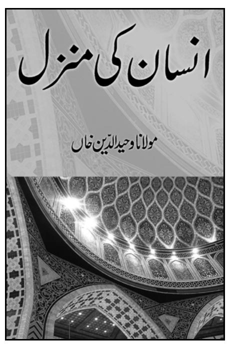
مساجد اور مدارس اور دینی اداروں کے لیے مولانا وحید الدین خاں کی دس کتابوں کا ایک منتخب سیٹ تیار کیا گیا ہے۔ خواہش مند حضرات آرڈر روانہ کر کے اس کو خصوصی رعایتی قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں۔ نیز جو حضرات کتابوں کا یہ سیٹ مذکورہ اداروں کو اپنی طرف سے ہدیہ کے طور پر دینا چاہتے ہوں، وہ بھی اِس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر آرڈر کے ساتھ ماہ نامہ الرسالہ ایک سال کے لیے اعزازی طور پر مفت جاری کیا جائے گا۔ ملنے کا پتہ درج ذیل ہے:

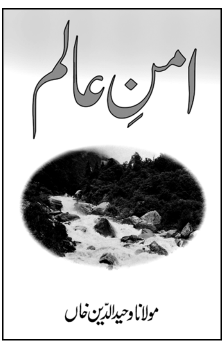
Al-Risala

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013

Tel. 24355454, 24355729, email: info@goodwordbooks.com







مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اسلامی انقلاب کی تحریک بیسویں صدی کے نصف اول میں شروع ہوئی اور صدی کے آخر تک پورے برصغیر ہند میں پھیل گئی۔ علماء اسلام کی طرف سے اس تحریک پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے ردّعمل سامنے آئے۔ زیر نظر کتاب میں اس تحریک کا اور اس کے بانی کی شخصیت کا علمی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب ایک جامع مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

